محترم قاضی صاحب

قاضی حسین احمد چل بسے۔ عقیدت ومحبت کے پھول اب بے مصرف ہو گئے۔ تنقید واختلاف کے سارے تیر اب ترکش میں پڑے رہیں گے۔ قاضی صاحب وہاں پہنچ گئے ہیں جہاں انسان ان باتوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ ان کا نامۂ اعمال بند ہو چکا۔ ہماری کتاب البتہ کھلی ہے۔ لاریب! ہم نے بھی اپنے پروردگار کے دربار میں جانا اور اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔ عقیدت کا بھی اور تنقید کا بھی۔ یہ اس ہستی کا دربار ہے جو دل کے کسی گوشے میں انگڑائی لینے والے خیال سے بھی واقف ہے۔

قاضی صاحب غیر معمولی تحرک اور توانائی رکھنے والے تھے۔ تین بار ان کا دل کھولا گیا، لیکن ان کی سرگرمیوں میں کسی ڈاکٹر کا نشتر حائل نہ ہو سکا۔ ڈاکٹر ہی کیا، کسی مخالف کا وار اور کسی تنقید کا حملہ ان کے راستے کی دیوار نہ بن سکا۔ وہ جسے درست سمجھتے تھے، اس پر قائم رہے اور اسی استقامت کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو گئے۔

قاضی صاحب بائیس برس جماعت اسلامی پاکستان کے امیر رہے۔ ان کے دور امارت میں جماعت کے خدوخال بدل گئے۔ پرانی صورت سے مانوس لوگوں کو نئی شکل اچھی نہیں لگی۔ اختلاف کی لہریں سونامی بن گئیں اور جماعت کو ایک نئے ماچھی گوٹھ سے گزرنا پڑا۔ یہ کم تکلیف دہ نہیں ہوتا کہ نیا سفر درپیش ہو اور پرانے ساتھی بچھڑ جائیں۔ یہ قافلہ پہلی بار ماچھی گوٹھ سے گزرا تو سید ابوالاعلیٰ مودودی کو مولانا امین احسن اصلاحی کی جدائی کا صدمہ سہنا پڑا۔ مولانا اصلاحی نے اپنے سابق امیر کے نام آخری خط کا اختتام اس جملے پر کیا: ''میں جانتا ہوں کہ آپ کی رفاقت سے محروم ہو کر میں کیا کچھ کھو رہا ہوں، لیکن آپ کو بھی یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اگر آپ نے مجھ جیسے خیر خواہ مخلص کے مشوروں کی قدر نہیں کی ہے تو آپ کو برے مشیروں کے مشورے ماننا پڑیں گے......'' مولانا اصلاحی تو عالم تھے اور

اس جدائی کے باوصف ان کا جنون فارغ نہیں بیٹھا۔انھوں نے ''تدبر قرآن'' جیسا شاہ کار تخلیق کر ڈالا،مگر انھیں سید مودودی جیسا ساتھ میسر نہ آسکا۔اس کی کسک ساری عمران کے ہم رکاب رہی۔افسوس در افسوس یہ ہے کہ مولانا مودودی کے بارے میں مولانا اصلاحی کی پیش گوئی بھی پوری ہوئی۔قاضی صاحب امیر ہوئے تو اختلاف کرنے والے نعیم صدیقی مرحوم جیسے لوگ تھے۔ان کا معاملہ بھی یہ تھا کہ ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے۔وہ داغ مفارقت دے گئے۔جماعت کو پھر کوئی نعیم صدیقی نہ مل سکا۔بایں ہمہ نعیم صدیقی کو بھی کوئی جماعت نہ مل سکی۔وہ مولانا اصلاحی نہ تھے۔یوں وہ بھی گوشۂ گم نامی کی نذر ہو گئے۔

قاضی صاحب امیر بنے تو اس وقت تک جماعت کی جدوجہد لاحاصل تھی۔پچاس برس بعد بھی اقتدار کے ایوان ان سے اتنے ہی فاصلے پر تھے، جتنے پہلے دن تھے۔جماعت کا فلسفہ یہ ہے کہ اصلاح صرف صالحین کو منصب قیادت تک پہنچانے ہی سے ہو سکتی ہے۔جب یہ منصب دور سے دور تر ہوتا دکھائی دیا تو نئی سوچ کی ضرورت پیدا ہوئی۔اس وقت فکری قیادت کے منصب پر خرم مراد مرحوم فائز تھے۔میں انھیں جماعت کا پہلا مجتہد فی المذہب کہتا ہوں۔ان کے نخل فکر پر پاکستان اسلامک فرنٹ کے برگ و بار آئے تو قاضی صاحب کے جنون کو گویا ایک میدان عمل مل گیا۔ جماعت میں یہ خیال مستحکم ہوا کہ جمہوری معاشرے میں محدود رکنیت کے اصول پر قائم جماعت کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔خرم مراد نے نئی سوچ دی کہ انتخابات توسیع دعوت کے لیے نہیں، جیتنے کے لیے لڑے جاتے ہیں۔قاضی صاحب اس کی عملی تفسیر بن کر مرد میدان بن گئے۔انھوں نے چاہا کہ جماعت کی کایا کلپ ہو جائے اور لوگ نئے زاویے سے سوچنے لگیں۔انھوں نے کہا ''مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی ایک جیسی برائیاں ہیں''۔جماعت اس سے پہلے یہ کہتی رہی تھی کہ پیپلز پارٹی جیسی کوئی برائی نہیں ہو سکتی۔جماعت کے لوگوں نے قاضی صاحب کی بات مان کر نہیں دی۔محمد صلاح الدین مرحوم جیسے اہل صحافت نے قاضی صاحب کے مقابلے میں جماعت کے نظریاتی کارکن کو زیادہ متاثر کیا۔انتخابات ہوئے تو معلوم ہوا کہ جماعت کا نظریاتی کارکن قاضی صاحب سے اتفاق نہیں کرتا۔قاضی صاحب کو لوٹنا پڑا۔یہ مراجعت، میرا تاثر ہے کہ ایک مایوسی میں ڈھل گئی۔قاضی صاحب نے اپنے خوابوں کی تعبیر کہیں اور تلاش کرنا چاہی۔کبھی متحدہ مجلس عمل اور کبھی ملی یک جہتی کونسل۔یہ ان کا آخری پڑاؤ تھا۔

قاضی مزاجاً میدان کارزار کے آدمی تھے۔مجاہد تھے۔سیاست کا میدان ان کے جذبۂ جنوں کے لیے ایک قفس تھا۔انھیں اپنی اڑان کے لیے افلاک کی وسعت چاہیے تھی۔ان کی قوت کار کو تو ایسا میدان چاہیے تھا جہاں روز نئے چیلنج ہوں۔ان کا معاملہ وہی تھا جو اقبال نے بیان کیا ہے کہ

خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں
وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد

انھوں نے میدان سیاست کو بھی میدان جنگ بنانا چاہا۔ وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ سیاست کا مزاج نہیں بدلا اور قاضی صاحب بھی خود کو نہ بدل سکے۔ دونوں میں کش مکش جاری رہی، یہاں تک کہ آخری بلاوا آ گیا۔

قاضی صاحب سے اختلاف کے بہت سے زاویے تھے۔ لیکن ان کا احترام اس سے ماورا تھا۔ ان کا دور امارت ختم ہوا تو اسلام آباد میں ان کے اعزاز میں ایک تقریب ہوئی۔ تمام مذہبی اور سیاسی نقطہ ہاے نظر کی نمایندگی تھی۔ اس وقت کے وزیر قانون بابر اعوان بھی تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ نواب زادہ نصراللہ خان کے بعد قوم کو ایک ایسی شخصیت کی ضرورت ہے جو پوری قوم کو جمع کر سکتی ہو۔ اب نظریں اٹھتی ہیں تو قاضی صاحب کی طرف۔ یہ ان کے لیے بڑا خراج تحسین تھا۔ یقیناً وہ اس کے مستحق تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس حوالے سے شاید ہی کوئی دوسرا نام پیش کیا جا سکے۔ اس منصب کے لیے مقاصد جلیل ہونے چاہییں۔ اور یہاں ان لوگوں کا راج ہے جو قلیل مقاصد کے اسیر ہیں۔

قاضی صاحب کئی حوالوں سے یاد رکھے جائیں گے۔ میرے نزدیک ان کی سب سے بڑی قومی خدمت یہ ہے کہ انھوں نے مسلکی اختلاف کی خلیج کو کم کیا۔ متحدہ مجلس عمل کی سیاست بحث کا موضوع رہے گی لیکن اس فورم کے وجود میں آنے سے مذہبی مسالک کے مابین فاصلہ کم ہوا۔ یہی کردار ملی یک جہتی کونسل بھی ادا کر سکتی ہے اگر سیاست دوراں سے دور رہے۔ میرا کہنا یہ ہے کہ ان کی وفات سے اگر کوئی سب سے زیادہ متاثر ہوا ہے تو وہ یہی کونسل ہے۔ یہ کم المیہ نہیں کہ اس قوم کے پاس اب قاضی صاحب کا متبادل کوئی نہیں ہے جو سب مسالک کو ایک جگہ جمع کر سکے۔

قاضی صاحب انسان تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ معصوم نہیں تھے۔ ہماری روایت یہی ہے کہ جانے والے کی خوبیوں کو یاد کیا جاتا ہے۔ قاضی صاحب کے معاملے میں ان کی تلاش مشکل نہیں۔ ہم انھیں تادیر یاد رکھیں گے۔ قاضی حسین احمد صاحب ان لوگوں میں سے تھے جن کے لیے زندگی ان ہی شب و روز کا نام نہیں ہے جو سطح زمین پر بسر ہوتے ہیں۔ وہ اس زندگی پر یقین رکھتے تھے جو کبھی ختم نہیں ہو گی۔ ایسا آدمی کبھی ناکام نہیں ہوتا۔ عقیدت و محبت اور تنقید و اختلاف کا ہر رشتہ ختم ہوا۔ صرف دعا کا رشتہ باقی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ انھیں اپنی مغفرت سے نوازے اور اس شہر کا مکیں بنائے جس کی تمنا ہر مسلمان اپنے دل میں رکھتا ہے۔ جہاں نہریں بہتی ہیں اور ایک دائمی آسودگی شہریوں کا مقدر ہوتی ہے۔

—— خورشید احمد ندیم

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دعوت کی قوت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں ۱۰ محرم کو یہودیوں کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیروی میں بنی اسرائیل کی فرعون سے آزادی کی خوشی میں روزہ رکھتے دیکھا تو فرمایا کہ ہم بھی موسی علیہ السلام کو مانتے ہیں، چنانچہ ہم بھی روزہ رکھیں گے۔

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی ہمارے نبی ہیں۔ آپ اور آپ کی کتاب کو مانے بغیر تو ہمارے ایمان کی تکمیل ہی نہیں ہوتی۔ مذہبی لحاظ سے اسلام کے قریب ترین مذہب بھی مسیحیت ہی ہے۔ ابتدائے اسلام کے وقت جب مکہ میں مشرکین کے مظالم حد سے بڑھنے لگے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو حبشہ کی جانب ہجرت کرنے کی ہدایت فرمائی جہاں ایک عیسائی بادشاہ (نجاشی) کی حکومت تھی۔ اور جس نے صحیح معنوں میں ان مظلوم مسلمانوں کی مدد بھی کی۔ اسی طرح جب عرب سے متصل رومی مقبوضات (اردن، شام اور فلسطین) پر ایرانی مجوسیوں کی فتح ہوئی تو عرب کے مسلمان اس پر بہت غمگین ہوئے اور مشرکین خوش۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے سورۂ روم میں پیشین گوئی فرمائی کہ ۱۰ برس سے پہلے پہلے عیسائی رومیوں کو پھر فتح نصیب ہوگی جس سے مسلمانوں کو حوصلہ ملا۔ اسلام نے مسلمانوں کو مسیحی خواتین کے ساتھ شادی کرنے کی بھی اجازت دی ہے۔ ایک زاویے سے سوچیں تو مسلمان اور عیسائی، دونوں حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کی اولاد ہونے کے باعث آپس میں کزن ہیں۔

چند ہفتے قبل پوری دنیا میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یوم پیدایش منایا گیا۔ آپ کو یاد کیا گیا۔ آپ کی تعلیمات کی تذکیر کی گئی۔ چنانچہ ہم بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یاد کرتے ہیں اور ان کی زندگی سے روشنی پا کر اپنی زندگی اور اپنے ملک کے حالات سنوارنے کی کوشش کرتے ہیں۔

حضرت مریم علیہا السلام، بنی ہارون کی ایک زاہدہ، پاک باز دوشیزہ جو حضرت زکریا علیہ السلام کے زیر تربیت تھیں، بیت المقدس میں معتکف تھیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک فرشتہ آیا اور انھیں ایک پاکیزہ فرزند کی بشارت دی۔ حضرت مریم علیہا السلام بولیں: ''میرے ہاں لڑکا کس طرح پیدا ہوسکتا ہے، مجھے تو کسی مرد نے چھوا تک نہیں۔'' فرشتے نے جواب دیا: ''اللہ تعالیٰ جس طرح چاہتا ہے، پیدا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جب کسی شے کے لیے حکم

کرتا ہے تو کہہ دیتا ہے کہ ''ہو جا'' اور وہ ہو جاتی ہے۔''

چنانچہ معجزے کا صدور ہوا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدایش ہوگئی تو آپ ان کو لے کر اپنی بستی کی طرف چلی گئیں۔ لوگوں نے جب حضرت مریم علیہا السلام کی گود میں بچہ دیکھا تو طعنہ دیا۔ حضرت مریم اللہ کے حکم کے مطابق خاموش رہیں اور بچے (حضرت عیسیٰ) کی طرف اشارہ کر دیا۔ اسی وقت حضرت عیسیٰ بول اٹھے: ''میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اس نے مجھے کتاب عطا فرمائی، پیغمبر بنایا اور میں جہاں کہیں بھی موجود ہوں مجھے اللہ نے خیر و برکت کا ذریعہ ٹھہرایا۔'' (مریم: ۳۰-۳۱)

جب لوگوں نے دودھ پیتے بچے کی زبان سے یہ الفاظ سنے تو ان کو بڑی حیرت ہوئی اور ان کی حضرت مریم کے حوالے سے غلط فہمی بھی رفع ہوگئی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بہت سے معجزات عطا کیے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بنی اسرائیل کی طرف نبی بنا کر بھیجا۔ آپ گلی گلی میں جا کر لوگوں کو اللہ کے اس بے آمیز دین کی طرف بلاتے جسے بنی اسرائیل کے علما نے بگاڑ دیا تھا۔ لیکن تمام معجزات اور ان کی تبلیغ کا کوئی اثر نہ ہوا۔ بنی اسرائیل جو اس وقت کی بڑی ہی نافرمان اور سرکش قوم تھی، آپ کے سخت خلاف ہوگئی اور آپ کے لیے مسائل پیدا کرنا شروع کر دیے۔ لیکن آپ نے ان کی مخالفت کی کوئی پروا نہ کی اور اپنا فرض پوری شان کے ساتھ ادا کرتے رہے۔ جس کی بدولت ان کی قوم میں سے صرف چند لوگ ان پر ایمان لائے۔

اُس وقت فلسطین پر رومیوں کی حکومت تھی۔ لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کے خلاف کوئی تحریک برپا نہیں کی۔ انھوں نے اپنی قوم کے بالا دست طبقات کو اپنی دعوت کا پہلا مخاطب بنایا اور ان کے باطل عقائد و اعمال پر سخت تنقیدیں کیں۔ جب وہ اصلاح پر آمادہ نہ ہوئے تو آپ نے عام لوگوں کو مخاطب بنایا۔ وہ مچھلیاں پکڑنے والوں کے پاس گئے۔ اور پھر وہی ان کے حواری بنے۔ جیسے جیسے دن گزرتے گئے آپ کے ماننے والوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ آپ کے مخالفین یہ سب دیکھ کر حسد میں مبتلا ہو گئے اور ان کو خطرہ محسوس ہوا کہ آپ کی بڑھتی ہوئی مقبولیت ان کے لیے کسی وقت خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے آپ کے خلاف مختلف قسم کی سازشیں کرنا شروع کر دیں۔

بنی اسرائیل کی گہری سازشوں کی وضاحت کرتے ہوئے سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

''تورات میں زنا کی سزا موجود تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عہد میں یہودی علما فقہا امرا اور عوام اس قانون کو

عملاً منسوخ کر چکے تھے۔ حضرت عیسیٰ کی دعوت کو روکنے کے لیے علماے یہود نے ایک چال چلی ۔ وہ ایک زانیہ عورت کو پکڑ لائے کہ اس کا فیصلہ کریں۔ ان کا مقصد یہ تھا اس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کنویں میں نہیں تو کھائی میں ضرور گریں۔ یعنی اگر حضرت عیسیٰ سنگ ساری کے سوا کوئی اور سزا تجویز کریں گے تو آپ کو یہ کہہ کر بدنام کیا جائے کہ لیجیے نرالے نبی تشریف لائے ہیں جنھوں نے دنیوی مصلحت کی خاطر خدائی قانون بدل ڈالا۔ اگر سنگ ساری کا حکم دیں گے تو باغی بنا کر رومی قانون کے ساتھ آپ کو ٹکرا دیا جائے اور دوسری طرف قوم سے کہا جائے گا کہ مانو اس نبی کو، دیکھ لینا اب تورات کی پوری شریعت تمھاری پیٹھوں اور جانوں پر برسے گی۔ لیکن حضرت عیسیٰ نے ایک ہی فقرے میں ان کی چال کو انھی پر الٹ دیا۔ آپ نے فرمایا تم میں سے جو خود پاک دامن ہو وہ آگے بڑھ کر اسے پتھر مارے۔ یہ سنتے ہی فقیہوں کی ساری بھیڑ چھٹ گئی۔ ایک ایک منہ چھپا کر وہاں سے نکلنے لگا۔ اور اس طرح ان فقہا کی اخلاقی حالت بھی برہنہ ہو گئی۔ جب عورت تنہا کھڑی رہ گئی تو حضرت عیسیٰ نے اسے نصیحت فرمائی اور توبہ کرا کر رخصت کر دیا۔ کیونکہ نہ آپ قاضی تھے کہ مقدمے کا فیصلہ کرتے نہ اس پر کوئی شہادت قائم ہوئی تھی اور نہ کوئی اسلامی حکومت قانون الٰہی نافذ کرنے کے لیے موجود تھی۔'' (تفہیم القرآن،۳/ ۳۲۲)

دلیل و برہان کے میدان سے شکست کھانے کے بعد بنی اسرائیل کی قیادت رومی بادشاہ کو گمراہ کرنے میں کامیاب ہو گئی کہ یہ عیسیٰ (علیہ السلام) صرف ہمارے لیے ہی نہیں، بلکہ آپ کی حکومت کے لیے بھی خطرہ بن سکتے ہیں۔ اگر آپ نے ابھی سے ان کو نہ روکا تو نہ صرف یہ کہ ہمارا دین مٹ جائے گا، بلکہ وہ آپ کی حکومت پر بھی قبضہ کر لیں گے۔ اور پھر رومی بادشاہ بھی حضرت عیسیٰ کی جان کے درپے ہو گیا اور اپنی طرف سے انھیں صلیب دے دی۔ لیکن دلیل و برہان، دعوت و تبلیغ اور ایثار و قربانی نے اپنی قوت کو منوا لیا، بعد میں حضرت عیسیٰ کے حواریوں کی تبلیغ سے رومی حکومت نے بھی عیسائیت قبول کر لی۔ بلکہ پھر رومی خود عیسائیت کے مبلغ بن گئے۔ برطانیہ میں بھی عیسائیت رومی مبلغین نے پھیلائی اور آج ویٹی کن، عیسائیوں کے سب سے بڑے رومن کیتھولک مذہبی پیشوا پوپ کی بہت بڑی اقامت گاہ، روم ہی کے قریب ایک پہاڑی پر واقع ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے مشن کی تکمیل میں ہر طرح کے اشتعال کے باوجود کبھی مخالفین کے خلاف طاقت کا استعمال نہیں کیا۔ ہر ظلم پر صبر کیا۔ طاقت سے دوسرے کا جسم جیتنے کے بجاے دلیل اور تعلیم سے دل جیتنے کی کوشش کی، بلکہ یہاں تک فرمایا کہ ظالم ایک گال پر تھپڑ مارے تو دوسرا گال بھی حاضر کر دو۔ اس حکمت عملی کی وجہ یہ تھی کہ حضرت عیسیٰ کے پاس سیاسی اقتدار نہ تھا اس لیے آپ نے مخالفین کے خلاف کوئی جنگ نہیں کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مکہ میں ہجرت مدینہ سے قبل سیاسی اقتدار میسر نہ تھا۔ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس وقت

کوئی جنگ کی اور نہ طاقت کا استعمال کیا۔ مخالفین کے مظالم کے باوجود صبر کیا اور خود کو دلیل اور تعلیم تک محدود رکھا۔ وہ تمام انبیا جن کو سیاسی اقتدار نہیں ملا انھوں نے یہی طرز عمل اختیار کیا اور برائی کو طاقت سے ختم کرنے کی کوشش نہیں کی۔

آج ہمارے ملک میں جو مذہبی عناصر دین کو ریاست کی سطح پر نافذ کرنا چاہتے ہیں انھیں بھی یہ کام انبیاے کرام کے طریقے ہی پر چل کر کرنا ہوگا۔ یعنی دلیل اور تعلیم سے لوگوں کے دلوں کو فتح کرنا ہوگا۔ جب دلوں میں تبدیلی آئے گی تو رویوں میں بھی تبدیلی آئے گی۔ اس کے بعد ریاست کی سطح پر بھی دین آپ سے آپ ظاہر ہو جائے گا۔ اس نفاذ میں کوئی منافقت نہیں ہوگی بلکہ گہرا خلوص ہوگا۔ اور پوری دنیا میں اس کے اثرات وثمرات پھیلیں گے۔ بصورت دیگر اس معاملے میں طاقت اور بارود کے استعمال سے صرف تباہی ملے گی صرف تباہی۔

—— محمد بلال

قاضی حسین احمد: ایک عہد ساز شخصیت

قاضی حسین احمد کی وفات قوم کے لیے ایک انتہائی دکھ کی گھڑی ہے، قوم آج ایک ایسے رہنما سے محروم ہو گئی ہے جو درحقیقت ان کی امنگوں کا ترجمان تھا، ایک ایسا رہنما جو امت مسلمہ کا درد رکھتا تھا اور جس کی وحدت کے لیے وہ تمام عمر سرگرم رہا۔

قاضی حسین احمد پاکیزہ اور مسنون سیاست کی ایک مسلسل اور بے نظیر مثال تھے۔ انھوں نے پیرانہ سالی کے باوجود نوجوانوں کی مانند ملی، سیاسی اور دینی خدمات سرانجام دیں۔ ان کی ہمت، جوش وولولہ، خلوص اور مقصد سے لگن قابل رشک اور کارکنوں کے لیے مثال تھی۔ انھوں نے اپنی بیماری کو مقصد میں رکاوٹ نہ بننے دیا، وہ عالم اسلام کے اتحاد کے سب سے بڑے نقیب تھے۔ قاضی حسین احمد عالم اسلام کی تمام اسلامی تحریکوں کے لیے قائد اور رہنما کا درجہ رکھتے تھے۔ ان کی رحلت مراکش سے انڈونیشیا تک پھیلی اس امت کے لیے نقصان عظیم ہے، وہ اپنے پیچھے ایک ایسا خلا چھوڑ گئے ہیں جسے بھرنے کے لیے ایک مدت درکار ہے۔

قاضی حسین احمد ۱۹۳۸ء میں ضلع نوشہرہ (صوبہ خیبر پختون خوا) کے گاؤں زیارت کاکا صاحب میں پیدا ہوئے

اور اپنے دس بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم گھر پر اپنے والد مولانا قاضی محمد عبدالرب سے حاصل کی پھر اسلامیہ کالج پشاور سے گریجوایشن کے بعد پشاور یونیورسٹی سے جغرافیہ میں ایم ایس سی کی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد جہانزیب کالج سیدو شریف میں بحیثیت لیکچرار تین برس تک پڑھاتے رہے۔ اس کے بعد ملازمت جاری نہ رکھ سکے اور پشاور میں اپنا کاروبار شروع کر دیا اور سرحد چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کے نائب صدر منتخب ہوئے۔

دوران تعلیم میں اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان میں شامل رہنے کے بعد قاضی حسین ۱۹۷۰ء میں جماعت اسلامی کے رکن بنے اور ۱۹۷۸ء میں جماعت اسلامی پاکستان کے سیکرٹری جنرل بنے اور ۱۹۸۷ء میں جماعت اسلامی پاکستان کے امیر منتخب کر لیے گئے۔ اور چار مرتبہ امیر منتخب ہوئے۔ ان کے جرأت مند عوامی کردار کی وجہ سے جب ''ظالمو! قاضی آ رہا ہے'' کا نعرہ وجود میں آیا تو دیکھتے ہی دیکھتے ضرب المثل بن گیا۔ یہ نعرہ صرف ایک نعرہ ہی نہیں تھا، بلکہ جماعت اسلامی کی سوچ اور فکر میں آنے والی ایک تبدیلی بھی تھی۔ انھوں نے جماعت اسلامی کو گلے سڑے نظام کی تبدیلی کا استعارہ بنا دیا۔ یہ وہ دور تھا جب آج کی طرح بات نہیں کی جاتی تھی، بلکہ اس زمانے میں شاید جماعت اسلامی ہی وہ واحد جماعت تھی جس نے قاضی حسین احمد کی امارت میں اس نعرے کو عام کیا۔ قاضی حسین احمد تھانوں میں مظلوموں کی امداد کے لئے پہنچ جاتے اور ظالموں کے خلاف خود مظلوموں کے ساتھ آ کھڑے ہوتے۔

انھی دنوں یہ بھی کہا گیا کہ قاضی حسین احمد جماعت اسلامی کے لیے گورباچوف کا کردار ادا کر رہے ہیں، کیونکہ جماعت اسلامی کی سیاست یا تنظیم کا یہ انداز نہیں تھا، جسے قاضی صاحب نے متعارف کرایا...... لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ بات ثابت ہوئی کہ قاضی حسین احمد کی اس پالیسی نے جماعت اسلامی کو قومی دھارے کی ایک اہم سیاسی جماعت بنا دیا۔ ایک ایسی جماعت جس پر ایک خاص نظریے کی محدودیت کا لیبل لگا ہوا تھا، ایک موثر جماعت کے طور پر ابھری اور بعد ازاں اس تبدیلی کی علامت بن گئی۔ قاضی حسین احمد کی اس پالیسی کو خود جماعت کے اندر اس طرح سراہا گیا کہ انھیں جماعت کی دوبارہ امارت سونپ دی گئی۔ قاضی حسین احمد کا متحدہ مجلس عمل کی تخلیق میں بھی کلیدی کردار تھا۔ یہ سیاسی و مذہبی جماعتوں کا ایک ایسا اتحاد تھا، جس نے ایک اہم سیاسی طاقت کے طور پر اپنا وجود منوایا۔ اس کی مقبولیت کا ثبوت اس وقت ملا جب خیبر پختون خوا میں متحدہ مجلس عمل نے صوبائی حکومت بنائی اور قومی اسمبلی میں بھی قابل ذکر نشستیں حاصل کیں۔ اگرچہ متحدہ مجلس عمل سے وابستہ توقعات پوری نہ ہو سکیں اور مختلف مسائل کی وجہ سے سرحد میں ان کی حکومت کوئی قابل ذکر کام نہ کر سکی، جس کا خود قاضی حسین احمد بھی اعتراف کرتے تھے۔ متحدہ مجلس عمل کے ختم ہونے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ جماعت اسلامی اور مولانا فضل الرحمٰن کی سوچ مختلف تھی۔

قاضی حسین احمد ۱۹۸۵ء میں چھ سال کے لیے سینیٹ کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۹۹۲ء میں وہ دوبارہ سینیٹر منتخب ہوئے تاہم بعد ازاں حکومتی پالیسیوں پر احتجاج کرتے ہوئے استعفیٰ دے دیا۔ ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں قاضی صاحب دو حلقوں سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ تحریک نظام مصطفیٰ کے علاوہ افغانستان پر امریکی حملوں اور یورپ میں پیغمبر اسلام کی شان میں گستاخی پر مبنی خاکوں پر احتجاج کرنے پر گرفتار کیا گیا۔ دوران گرفتاری میں انھوں نے متعدد اہم مقالہ جات لکھے، جو بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ قاضی حسین احمد کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ قاضی صاحب کو اپنی مادری زبان پشتو کے علاوہ اردو، انگریزی، عربی اور فارسی پر عبور حاصل تھا۔ وہ ایک اعلیٰ پایے کے سیاست دان، سیاست میں شرافت کی علامت اور محبّ وطن پاکستانی تھے۔ میاں طفیل محمد مرحوم ومغفور کے بعد جب انھوں نے جماعت اسلامی کی امارت سنبھالی تو اس وقت جماعت اسلامی مارشل لا کی بی ٹیم کہلاتی تھی۔ سوویت یونین کے خلاف افغان مجاہدین کی جنگ آزادی کی بھرپور حمایت سے قاضی حسین احمد نے جماعت کو ایک متحرک سیاسی و مذہبی جماعت بنا دیا۔ وہ اپنی تقاریر میں علامہ اقبال کے اشعار استعمال کر قومی ایشوز کو اجاگر کرتے تھے۔ انھیں علامہ اقبال کا کلام ازبر تھا اور اس تناظر میں انھیں حافظ اقبال بھی کہا جاتا تھا۔ انھیں یہ اعزاز بھی حاصل رہا کہ انھوں نے جماعت کے جلسے اور جلوسوں کے اجتماعات کے روایتی انداز کو بدل کر اسے پر جوش اور جدید عوامی رنگ دیا۔ اس طرح وہ عام لوگوں کو صالحین کے قریب کرنے میں کچھ کامیاب بھی رہے دیگر جماعتوں کی مدد سے بننے والے اتحادوں میں شامل ہو کر اور عام انتخابات میں بھی بھرپور شرکت کر کے جماعت اسلامی کو سیاست کے عوامی دھارے میں شامل رکھا اور مشرف دور میں ۲۰۰۸ء کے انتخابات کا بائیکاٹ کر کے انھوں نے جماعت پر سے مارشل لا کی بی ٹیم کا ٹھپہ اتارنے کی بھی کوشش کی۔ قاضی حسین احمد ۷۴ سال کی عمر میں بھی ایک متحرک اور جواں ہمت رہنما کی طرح اپنا مشن جاری رکھے ہوئے تھے...... لیکن پھر اچانک ان کا بلاوا آ گیا اور وہ فانی دنیا سے مستقل دنیا میں چلے گئے۔

—— عقیل احمد انجم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ التوبہ

(۲)

(گذشتہ سے پیوستہ)

قَاتِلُوا الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ لَا بِالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ لَا یُحَرِّمُوۡنَ مَا حَرَّمَ اللّٰہُ وَ رَسُوۡلُہٗ وَ لَا یَدِیۡنُوۡنَ دِیۡنَ الۡحَقِّ مِنَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ حَتّٰی یُعۡطُوا الۡجِزۡیَۃَ

(اِن مشرکوں کے علاوہ) اُن اہل کتاب سے بھی لڑو جو نہ اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہیں، نہ اللہ اور اُس کے رسول کے حرام ٹھیرائے ہوئے کو حرام ٹھیراتے ہیں اور نہ دین حق کو اپنا دین بناتے ہیں[۱۷۳]،

۱۷۳؎ یہ لوگ اگرچہ ایمان کے مدعی تھے، لیکن درحقیقت اِن میں سے کسی چیز کو بھی نہیں مانتے تھے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...ایمان کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ اللہ کے شرائط کے تحت ہو، لیکن اُن کا ایمان اپنی خواہشوں اور بدعات کے تحت تھا۔ مشرکانہ عقائد ایجاد کر کے اُنھوں نے خدا کی نفی کر دی، اپنے آپ کو چہیتی اور مغفور امت قرار دے کر آخرت کا ابطال کر دیا اور اللہ اور رسول کی حرام ٹھیرائی ہوئی چیزوں کو جائز بنا کر شریعت کو کالعدم کر دیا۔ پھر ستم بالائے ستم یہ کیا کہ اللہ نے اپنے آخری رسول کے ذریعے سے اپنے وعدے کے مطابق جو دین حق بھیجا تو اُس کو نہ صرف یہ کہ قبول نہیں کیا، بلکہ اُس کی مخالفت میں اپنا پورا زور صرف کر دیا اور اُس کے خلاف برابر سازشوں میں سرگرم رہے۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۵۵۹)

عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۲۹﴾
وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ٌۨ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ذٰلِكَ
قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِئُوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى

(اُن سے لڑو)، یہاں تک کہ اپنے ہاتھوں سے جزیہ دیں اور ماتحت بن کر رہیں۔[۱۷۴] ۲۹
(اُن کا دین اب یہی ہے کہ) یہودی کہتے ہیں کہ عزیر خدا کے بیٹے ہیں[۱۷۵] اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ مسیح خدا کے بیٹے ہیں۔ یہ اُن کے اپنے منہ کی باتیں ہیں۔ وہ اُنھی منکروں کی سی بات کہہ رہے ہیں جو اُن

۱۷۴؎ یعنی مغلوب ہو کر اور اپنی اِس مغلوبیت اور محکومی کو تسلیم کر کے اُس کی علامت کے طور پر جزیہ ادا کریں۔ اوپر مشرکین کی سزا بیان ہوئی ہے کہ ایمان نہ لائیں تو قتل کر دیے جائیں۔ یہ اُن اہل کتاب کی سزا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اتمام حجت کے باوجود آپ کی دعوت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ یہ رعایت اِس لیے کی گئی ہے کہ اہل کتاب اصلاً توحید ہی سے وابستہ تھے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ وہ بھی شرک کے مرتکب تھے، مگر بنی اسمٰعیل کی طرح اُنھوں نے شرک کو دین اور عقیدے کی حیثیت سے اختیار نہیں کیا تھا۔ قرآن نے دوسری جگہ واضح کر دیا ہے کہ لوگ مشرک نہ ہوں تو قیامت میں بھی اِسی طرح رعایت کے مستحق ہوں گے۔ یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ قرآن کا یہ حکم بھی اُس کے قانون اتمام حجت کی ایک فرع اور اُنھی اقوام کے ساتھ خاص تھا جن پر خدا کے آخری پیغمبر کی طرف سے حجت پوری ہو گئی۔ اُن کے لیے یہ اُسی طرح کا عذاب تھا جو رسولوں کی تکذیب کے نتیجے میں اُن کے مخاطبین پر ہمیشہ نازل کیا جاتا رہا ہے۔ اُن کے بعد اب دنیا کے کسی غیر مسلم سے اِس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

۱۷۵؎ یہ وہی عزرا (Ezra) ہیں جنھیں یہودی اپنے دین کا مجدد کہتے ہیں۔ اِن کا زمانہ پانچویں صدی قبل مسیح کے لگ بھگ بتایا جاتا ہے۔ یہودی اپنے دور ابتلا میں تورات کو گم کر بیٹھے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اِنھی عزرا نے اُسے اپنی یادداشت سے ازسرنو مرتب کیا۔ چنانچہ بنی اسرائیل اِن کی بہت تعظیم کرتے تھے۔ قرآن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جزیرہ نمائے عرب میں جو یہودی قبائل آباد تھے، اُن کے اندر یہ تعظیم اِس حد تک بڑھ گئی تھی کہ اُنھوں نے اِن کو خدا کا بیٹا بنا ڈالا تھا۔

یُؤْفَکُوْنَ ﴿۳۰﴾ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَھُمْ وَرُھْبَانَھُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَالْمَسِیْحَ ابْنَ
مَرْیَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوْٓا اِلٰھًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ سُبْحٰنَہٗ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ﴿۳۱﴾
یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَاھِھِمْ وَیَاْبَی اللّٰہُ اِلَّآ اَنْ یُّتِمَّ نُوْرَہٗ وَلَوْ کَرِہَ
الْکٰفِرُوْنَ ﴿۳۲﴾ ھُوَالَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی

سے پہلے (ہوگزرے) ہیں[۱۷۶]۔اُن پر خدا کی مار، وہ کہاں سے پھرے جاتے ہیں۔اللہ کے سوا اُنھوں نے اپنے فقیہوں اور راہبوں کو رب بناڈالا ہے اور مسیح ابن مریم کو بھی[۱۷۷]، دراں حالیکہ اُنھیں ایک ہی معبود کی عبادت کا حکم دیا گیا تھا۔اُس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، وہ پاک ہے[۱۷۸] اُن چیزوں سے جنھیں وہ شریک ٹھیراتے ہیں۔چاہتے ہیں کہ خدا کے اِس نور کو اپنے منہ کی پھونکوں سے بجھا دیں اور اللہ نے فیصلہ کر رکھا ہے کہ وہ اپنے نور کو پورا کر کے رہے گا، خواہ اِن منکروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو[۱۷۹]۔وہی ہے جس نے

۱۷۶؎ یہ اُن مشرک اقوام کی طرف اشارہ ہے جو اپنی دیو مالاؤں میں آفتاب کو خدا بنا کر اُس کے لیے بیٹا فرض کیے ہوئے تھیں۔یہود و نصاریٰ اُنھی سے متاثر ہوئے اور اپنی کتابوں کے بعض الفاظ کو موقع و محل سے ہٹا کر اُن کے وہ معنی بیان کرنے لگے جو اِن نئے مشرکانہ عقائد کے لیے بطور سند پیش کیے جا سکیں۔

۱۷۷؎ یعنی وہی حیثیت دے دی ہے جو رب العٰلمین کے لیے ماننی چاہیے۔چنانچہ اُن کے لیے تحلیل و تحریم کے خدائی اختیارات مان کر اُن کے ہر حکم اور ہر فیصلے کو اُسی طرح واجب الاطاعت سمجھتے ہیں، جس طرح خدا کے احکام اور فیصلوں کو واجب الاطاعت سمجھا جاتا ہے۔اُن کے مقابلے میں کتاب الٰہی کی کوئی صریح آیت اور پیغمبر کا کوئی واضح ارشاد بھی پیش کر دیا جائے تو اُسے کوئی اہمیت نہیں دیتے۔

۱۷۸؎ اصل میں 'سُبْحٰنَہٗ' کا لفظ آیا ہے۔یہ تنزیہہ کا کلمہ ہے۔استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اِس کے اندر توحید کی نہایت واضح منطقی دلیل بھی ہے۔وہ یوں کہ کسی چیز کی مسلم اور بنیادی صفات سے بالکل متناقض صفات کا اُس کے ساتھ جوڑ ملانا بالبداہت خلاف عقل ہے۔اِس اصول کے مطابق خدا کا کسی کو شریک ٹھیرانا اُس کی شان الوہیت کے منافی ہے، کیونکہ اِس سے اُس کی مسلمہ صفات کی نفی لازم آتی ہے۔''

(تدبر قرآن ۳/ ۵۶۳)

الدِّیۡنِ کُلِّہٖ وَلَوۡ کَرِہَ الۡمُشۡرِکُوۡنَ ﴿۳۳﴾
یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّ کَثِیۡرًا مِّنَ الۡاَحۡبَارِ وَالرُّھۡبَانِ لَیَاۡکُلُوۡنَ اَمۡوَالَ النَّاسِ

اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ (اِس سرزمین کے) تمام ادیان پر اُس کو غالب کردے، خواہ مشرکین اِسے کتنا ہی ناپسند کریں۔[180] ۳۰-۳۳

ایمان[181] والو، اِن فقیہوں اور راہبوں میں بہتیرے ایسے ہیں جو لوگوں کا مال باطل طریقوں سے

۱۷۹؎ یہ اکمال دین کی تمثیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ جو کچھ چاہتے ہیں، اُس کے علی الرغم جو دین ہم نے اپنے پیغمبر کو پہلی وحی سے دینا شروع کیا تھا، اُسے پورا کریں گے اور اُس کی دعوت وہاں تک پہنچا دیں گے، جہاں تک پہنچنا اُس کے لیے مقدر ہو چکا ہے۔

۱۸۰؎ یہ غلبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے اور اُن مشرکین کی خواہشوں کے علی الرغم قائم ہونا تھا جو آپ کے مخاطبین اولین تھے اور جن کا ذکر 'لَوۡ کَرِہَ الۡمُشۡرِکُوۡنَ' کے الفاظ میں ہوا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ یہاں لفظ 'کُلِّ'، کو اُسی تخصیص کے ساتھ لیا جائے جو ہم نے ترجمے میں واضح کر دی ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ قرآن کی یہ بات حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں دین حق کا غلبہ پورے جزیرہ نماے عرب پر قائم ہو گیا۔ یہ ایک سنت الٰہی کا ظہور تھا جو رسولوں کے باب میں جگہ جگہ بیان ہوئی ہے کہ اُن کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اللہ تعالیٰ اُنھیں غلبہ عطا فرماتے اور اُن کے منکرین پر اپنا عذاب نازل کر دیتے ہیں۔ اِس کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ آخرت کی جزا و سزا کا تصور بھی اُسی معیار پر ثابت کر دیا جائے جس معیار پر سائنسی حقائق معمل (laboratory) کے تجربات سے ثابت کیے جاتے ہیں۔ اِس کا انقلاب کی کسی جد و جہد سے کوئی تعلق نہیں ہے، جس طرح کہ دور حاضر کے بعض مفکرین نے سمجھا ہے۔ یہاں اِس کا ذکر مسلمانوں کو یہ بتانے کے لیے ہوا ہے کہ یہ اللہ کا فیصلہ ہے اور مشرکین اور اہل کتاب، دونوں کے خلاف جس آخری اقدام کا حکم اُنھیں دیا گیا ہے، وہ اِسی فیصلے کے نفاذ کے لیے دیا گیا ہے۔

۱۸۱؎ اوپر وہ جرائم بیان ہوئے ہیں جن کے مرتکب یہ لوگ اپنے خالق کے حقوق کے معاملے میں ہوئے، اب اِن کے وہ جرائم بیان ہو رہے ہیں جن کا ارتکاب یہ خلق کے معاملے میں کرتے رہے تھے۔ اِس میں بالخصوص علما اور مشائخ کا ذکر کیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

بِالۡبَاطِلِ وَیَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَالَّذِیۡنَ یَکۡنِزُوۡنَ الذَّہَبَ وَالۡفِضَّۃَ وَلَا یُنۡفِقُوۡنَہَا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ فَبَشِّرۡہُمۡ بِعَذَابٍ اَلِیۡمٍ ﴿۳۴﴾ یَّوۡمَ یُحۡمٰی عَلَیۡہَا فِیۡ نَارِ جَہَنَّمَ فَتُکۡوٰی بِہَا جِبَاہُہُمۡ وَجُنُوۡبُہُمۡ وَظُہُوۡرُہُمۡ ہٰذَا مَا کَنَزۡتُمۡ لِاَنۡفُسِکُمۡ فَذُوۡقُوۡا مَا کُنۡتُمۡ تَکۡنِزُوۡنَ ﴿۳۵﴾

کھاتے اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں[۱۸۲]۔ سو اُن لوگوں کو دردناک عذاب کی خوش خبری دو جو (اِن میں سے) سونا اور چاندی ڈھیر کر رہے ہیں اور اُسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے[۱۸۳]۔ اُس دن جب دوزخ میں (اُن کے) اِس (مال) پر آگ دہکائی جائے گی، پھر اُن کی پیشانیاں اور اُن کے پہلو اور اُن کی پیٹھیں اِس سے داغی جائیں گی ــــــ یہی ہے جس کو تم نے اپنے لیے جمع کر رکھا تھا۔ سو چکھو اُس کو جو تم جمع کرتے رہے ہو[۱۸۴]۔ ۳۴-۳۵

''... یہ خاص پہلو بھی ملحوظ رہے کہ عوام کے کردار کے بجائے یہاں علما اور مشائخ کے کردار کو بے نقاب کیا ہے تاکہ یہ حقیقت سامنے آجائے کہ جن کے علما اور مشائخ کا کردار اِس درجہ فاسد ہو چکا ہے، اُن کے عوام کا کیا ذکر اور اب اُن کی اصلاح کی کیا توقع! اصلاح کا یہ ذریعہ علما و مشائخ ہی ہو سکتے تھے۔ جب وہی مال و دولت کے پجاری بن کر رہ گئے ہیں تو اصلاح کن کے ہاتھوں ہو گی۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۵۶۵)

۱۸۲؎ یعنی جب کوئی دعوت اصلاح کے لیے اٹھتی ہے تو سب سے پہلے یہی اپنے الزامات، اعتراضات اور فتووں کے ساتھ اُس کا راستہ روکنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

۱۸۳؎ زکوٰۃ ادا کر دینے کے بعد حال اور مستقبل کی ذاتی اور کاروباری ضرورتوں کے لیے روپیہ جمع رکھنا ممنوع نہیں ہے، لیکن خلق یا خالق کی طرف سے اُس کے انفاق کا کوئی مطالبہ سامنے آجائے اور آدمی اُسے خرچ کرنے سے انکار کر دے تو اُس کی سزا وہی ہے جو قرآن نے آگے بیان کر دی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... یہی انفاق حکمت کا خزانہ بخشتا ہے، اِسی سے نور قلب میں افزونی ہوتی ہے۔ اگر مال کے ڈھیر رکھتے ہوئے کوئی شخص اپنے پاس پڑوس کے یتیموں، بے کسوں، ناداروں سے بے پروا رہے یا دعوت دین، اقامت دین، تعلیم دین اور جہاد فی سبیل اللہ کے دوسرے کاموں سے بے تعلق ہو جائے تو وہ عند اللہ مواخذے اور مسئولیت سے بری نہیں ہو سکتا، اگرچہ اُس نے اپنے مال کا قانونی تقاضا پورا کر دیا ہو۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۵۶۶)

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ وَقَاتِلُوا
الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿٣٦﴾ اِنَّمَا
النَّسِيْٓءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّيُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا

(ایمان والو، تم اِن سے لڑو اور یاد رکھو کہ) اللہ کے نزدیک جس دن سے اُس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا ہے، مہینوں کی تعداد اللہ کے نوشتے میں بارہ ہی ہے[185] جن میں چار مہینے حرمت والے ہیں[186]۔ یہی دین قیم ہے[187]، سو اِن (چار مہینوں) میں (کسی کے خلاف اقدام سے) اپنی جان پر کوئی ظلم نہ کر بیٹھو اور مشرکوں سے (بالخصوص) سب مل کر لڑو، جس طرح وہ سب مل کر تم سے لڑتے ہیں اور جان رکھو کہ اللہ اُن کے ساتھ ہے جو (اُس کے حدود کی خلاف ورزی سے) بچنے والے ہوں[188]۔ (حقیقت یہ

۱۸۴؎ یہ سزا جرم کی مناسبت سے ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''...دولت جمع کرنے کی سرگردانی میں بڑا دخل دو چیزوں کو ہوتا ہے: ایک ہم چشموں میں اپنا سر اونچا رکھنے کی خواہش، دوسری اپنے ذاتی آرام و راحت کی طلب۔ فرمایا کہ جو لوگ دنیا میں سربلندی اور فخر کی خاطر دولت جمع کریں گے، اُن کی دولت بروز قیامت اُن کی پیشانی پر داغ لگائے گی۔ اِسی طرح جو لوگ نرم ریشمیں و مخملیں گدوں، غالیچوں، قالینوں اور صوفوں کے درپے ہو کر انفاق کی سعادت سے محروم رہیں گے، اُن کی یہ بچائی ہوئی دولت اُن کے پہلوؤں اور اُن کی پیٹھوں کو زخمی کرے گی۔'' (تدبر قرآن ۳/۵۶۷)

۱۸۵؎ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ اہل عرب نسی کی خاطر، جس کا ذکر آگے آ رہا ہے، مہینوں کی تعداد ۱۳ یا ۱۴ بنا لیتے تھے، جبکہ چاند مہینے میں ایک ہی دفعہ ہلال بن کر طلوع ہوتا ہے اور اِس حساب سے سال کے ۱۲ ہی مہینے بنتے ہیں۔

۱۸۶؎ یعنی ذی القعدہ، ذی الحجہ اور محرم حج کے لیے اور رجب عمرے کے لیے۔

۱۸۷؎ یعنی یہ حکم کہ سال میں چار مہینے حج و عمرہ کی غرض سے جنگ و جدال کے لیے حرام ہوں گے۔ فرمایا کہ یہ ٹھیک وہی دین ہے جو خدا نے اپنے پیغمبروں، بالخصوص ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کے ذریعے سے اُن کے ماننے والوں کو دیا تھا۔

لِّيُوَاطِئُوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَيُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ زُيِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۷﴾

ہے کہ) مہینوں کا ہٹا دینا[189] کفر میں ایک اضافہ ہے جس سے یہ منکرین گمراہی میں مبتلا کیے جاتے ہیں[190]۔ کسی سال یہ حرام مہینے کو حلال کر لیتے ہیں اور کسی سال اُس کو حرام ٹھیراتے ہیں تاکہ خدا کے حرام کیے ہوئے مہینوں کی گنتی پوری کر کے اُس کے حرام کیے ہوئے کو (اپنے لیے) حلال بنا لیں۔ اِن کے برے اعمال اِن کے لیے خوش نما بنا دیے گئے ہیں[191]۔ اللہ کا فیصلہ ہے کہ اِس طرح کے منکروں کو وہ راہ یاب نہیں کرے گا۔ ۳۶-۳۷

۱۸۸؎ مطلب یہ ہے کہ پیچھے جس قتال کا حکم دیا گیا ہے، وہ اگرچہ خدا کا عذاب ہے، لیکن اُس میں بھی حرام مہینوں کا لحاظ ضروری ہے۔ تاہم اِن کے حدود حرمت کا لحاظ رکھتے ہوئے جنگ لازماً کی جائے گی اور یہ جنگ مشرکین سے من حیث الجماعت ہوگی۔ اِس میں کسی رشتہ وقرابت، کسی دوستی اور کسی سیاسی، معاشرتی یا معاشی مفاد کی بنا پر کوئی فرق نہیں کیا جائے گا۔ یہ جنگ کفر کے استیصال کے لیے ہے، اِس میں اِس نوعیت کے تمام تعلقات بالاے طاق رکھ دیے جائیں گے۔ یہی ایمان واسلام کا تقاضا ہے۔

۱۸۹؎ اصل میں 'نَسِيْٓءُ' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہ عرب جاہلیت کی اصطلاح ہے۔ اِس کے دو طریقے تھے: ایک یہ کہ کسی کے خلاف لڑائی چھیڑنا پیش نظر ہو تو حرام مہینے کی جگہ حلال مہینہ رکھ کر لڑائی کو جائز کر لیا جائے۔ دوسرے یہ کہ تجارتی اغراض کے لیے قمری سال کو شمسی سال کے مطابق کرنے کے لیے اُس میں کبیسہ کا ایک مہینہ بڑھا دیا جائے تاکہ حج ہمیشہ ایک ہی موسم میں آتا رہے۔

۱۹۰؎ نسی کا یہ طریقہ اہل عرب اِس لیے اختیار کرتے تھے کہ اِس طرح کاروباری مفادات بھی محفوظ رہتے تھے اور حرام مہینوں کی تعداد بھی پوری ہو جاتی تھی جو دین داری کا تقاضا تھا، لیکن قرآن نے اِسے کفر میں ایک اور اضافہ قرار دیا۔ اِس لیے کہ ابراہیم علیہ السلام کے جس دین سے وہ پہلے ہی بڑی حد تک منحرف تھے، اُن کی یہ حیلے بازی اُس سے مزید انحراف کا باعث بن جاتی تھی۔ فرمایا کہ اِس سے یہ خدا کو دھوکا دینا چاہتے ہیں، لیکن الٹا اُس کے قانون کی زد میں آ جاتے ہیں اور گمراہی کے حوالے کر دیے جاتے ہیں۔ خدا کا قانون یہی ہے کہ جو لوگ دین وشریعت کے

معاملے میں حیلہ بازی کے طریقے اختیار کریں، وہ کبھی راہ یاب نہیں ہوتے۔ اللہ اُنھیں خود اُن کے پیدا کیے ہوئے اندھیروں میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔

۱۹۱؎ یعنی اِس حیلہ بازی کو بڑی فقاہت سمجھتے ہیں، لیکن نہیں جانتے کہ یہ آخری درجے کی بدعملی ہے جو شیطان نے اِن کی نگاہوں میں خوش نما بنادی ہے۔

[باقی]

"...کسی کی آنکھیں کھلی ہوئی ہوں تو اس کے لیے اس دنیا میں معجزات کی کمی نہیں ہے۔ وہ آسمان کو دیکھے۔ قدرت نے اس کو ستاروں اور سیاروں، چاند اور سورج، شفق اور قوس قزح اور دوسرے بے شمار گوناگوں و بوقلموں عجائب سے کس طرح سنوارا ہے کہ جس طرف بھی نگاہ اٹھتی ہے انسان حیران و ششدر ہو کے رہ جاتا ہے اور پکار اٹھتا ہے کہ 'رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا'، کہ یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل اور کسی اتفاقی حادثہ کے طور پر ظہور میں آ جانے والی چیز نہیں ہے بلکہ یہ ایک حکیم و علیم اور ایک بے پناہ قدرت و حکمت کے مالک کی بنائی ہوئی دنیا ہے۔ اس کی قدرت و حکمت کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ وہ اس کو پیدا کر کے یوں ہی چھوڑ نہ دے بلکہ یہ لازم ہے کہ وہ ایک ایسا دن بھی لائے جس میں وہ سب کو اکٹھا کر کے ان کے اعمال نیک و بد کا حساب کرے اور ان کے اعمال کے مطابق ان کو جزا یا سزا دے۔" (تدبر قرآن ۴/۳۵۲)

معز امجد

ترجمہ: شاہد رضا

قبیلۂ قریش کے بارہ حکمران

روی جابر بن سمرة أنه سمع رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم قال: إن هـذا الأمر لا ینقضی حتی یمضی فیهم إثنا عشرة خلیفة، ثم تکلم بکلام خفی علی. فقلت لأبی: ما قال؟ قال: کلهم من قریش.

حضرت جابر بن سمرہ[1] (رضی اللہ عنہ) بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے ہوئے سنا: (غلبے اور طاقت کی[2]) یہ موجودہ حالت اس وقت تک یقیناً رہے گی، جب تک (آخر کار) ان میں بارہ حکمران گزر یں گے[3]۔ (حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:) پھر آپ نے کچھ فرمایا جس کو میں سمجھ نہ سکا[4]۔ لہٰذا میں نے اپنے والد سے پوچھا: آپ نے کیا فرمایا؟ انھوں نے جواب دیا: یہ (حکمران) قریش میں سے ہوں گے۔

ترجمے کے حواشی

۱۔ یہ حدیث صرف حضرت جابر بن سمرہ (رضی اللہ عنہ) نے بیان کی ہے۔ یہ حقیقت بعض دیگر روایات میں دی گئی معلومات کے مطابق ہے، جن کے مطابق نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ الفاظ درج ذیل مواقع پر ارشاد فرمائے

تھے:

ا۔ ماعزالاسلمی کو رجم کرنے کے بعد ایک اجتماع کے موقع پر[1]۔

ب۔ حجۃ الوداع کے اجتماع کے موقع پر[2]۔

ج۔ عرفات میں ایک اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے[3]۔

د۔ لوگوں کی کثیر تعداد کی موجودگی میں[4]۔

ہ۔ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ الفاظ قریش کے لوگوں کی موجودگی میں کہے تھے[5]۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عوامی بیان کی کسی متبادل روایت کے مکمل نہ ہونے کی وجہ سے کسی شخص کے دماغ میں اس روایت کی صحت کے بارے میں شبہ ہو سکتا ہے۔

۲۔ روایت باللفظ نہ ہونے کی وجہ سے اس بیان کو روایت کرنے میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ تاہم، درج بالا روایت گویا نمایاں اختلافی روایات میں بیان کردہ مطلب کا احاطہ کرتی ہے۔ مثلاً ''اسلام مضبوط رہے گا''، ''یہ دین مضبوط ہوتا رہے گا''، ''یہ دین قائم رہے گا'' اور ''یہ دین غلبہ حاصل کرتا رہے گا'' وغیرہ۔

۳۔ یہ روایت قانون الٰہی، علم نبی کے متعلق ہے، جس کے مطابق قریش کو بنی اسمٰعیل کے سردار اور نمائندہ ہونے کی حیثیت سے دنیا میں غلبہ دیا گیا تھا۔ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے لوگوں کو بتایا ہے کہ یہ غلبہ اس زمانے تک جاری رہے گا جس میں لوگ آخر کار قبیلۂ قریش کے بارہ مختلف حکمران دیکھیں گے۔

۴۔ بعض روایات میں یہ بات واضح ہے کہ جب نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے لوگوں کو آگاہ کیا کہ طاقت اور غلبے کی موجودہ حالت ایک طویل عرصے تک جاری رہے گی، تو لوگ خوش ہوئے، اپنی آوازوں کو بلند کیا اور اللہ تعالیٰ کی تعریف بیان کی، اس بلند آواز کی وجہ سے راوی یہ نہ سن سکے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کیا فرمایا تھا۔

---

[1] مسلم، رقم ۱۸۲۲۔ احمد، رقم ۲۰۸۶۲۔ ابویعلیٰ، رقم ۷۴۶۳۔

[2] احمد، رقم ۲۰۸۳۳، ۲۰۸۳۶، ۲۰۸۵۰، ۲۰۸۷۳۔

[3] احمد، رقم ۲۰۹۱۰، ۲۰۹۴۳، ۲۰۹۴۴، ۲۰۹۷۴۔

[4] ابوداؤد، رقم ۴۲۸۰۔ احمد، رقم ۲۰۸۹۲، ۲۰۹۰۹، ۲۰۹۲۱، ۲۰۹۶۵، ۲۱۰۸۸۔

[5] ابوداؤد، رقم ۴۲۸۱۔ احمد، رقم ۲۰۸۹۰۔ ابن حبان، رقم ۶۶۶۱۔

متون

بعض اختلافات کے ساتھ یہ روایت بخاری، رقم ۶۷۹۶؛ مسلم، رقم ۱۸۲۱-۱۸۲۲؛ ابوداؤد، رقم ۴۲۷۹-۴۲۸۱؛ ترمذی، رقم ۲۲۲۳؛ احمد، رقم ۲۰۸۲۴، ۲۰۸۳۳، ۲۰۸۳۶، ۲۰۸۴۱، ۲۰۸۵۰، ۲۰۸۶۲، ۲۰۸۶۸، ۲۰۸۷۰، ۲۰۸۷۳، ۲۰۸۷۴، ۲۰۸۹۰، ۲۰۸۹۲، ۲۰۹۰۲، ۲۰۹۰۹، ۲۰۹۱۰، ۲۰۹۲۱، ۲۰۹۳۴، ۲۰۹۴۳، ۲۰۹۴۴، ۲۰۹۶۰-۲۰۹۶۲، ۲۰۹۶۴، ۲۰۹۶۵، ۲۰۹۷۴، ۲۰۹۷۸، ۲۰۹۸۸، ۲۰۹۹۹، ۲۱۰۰۳، ۲۱۰۵۱، ۲۱۰۵۸، ۲۱۰۷۱، ۲۱۰۷۷، ۲۱۰۸۸؛ ابن حبان، رقم ۶۶۶۱-۶۶۶۳ اور ابویعلیٰ، رقم ۷۴۶۳ میں بیان ہوئی ہے۔

علاوہ ازیں، اوپر متن میں دیے گئے الفاظ مسلم، رقم ۱۸۲۱ میں روایت کیے گئے ہیں۔

بخاری، رقم ۶۷۹۶ میں 'إن هـذا الأمر لا ينقضي حتى يمضي فيهم إثنا عشرة خليفة' ((غلبے اور طاقت) کی یہ موجودہ حالت اس وقت تک یقیناً رہے گی، جب تک (آخر کار) ان میں بارہ حکمران گزر یں گے) الفاظ کے بجائے 'يكون إثنا عشر أميرًا' (بارہ سردار ہوں گے) کے الفاظ روایت کیے گئے ہیں، جبکہ مسلم، رقم ۱۸۲۱ ب میں 'لا يزال أمر الناس ماضيًا ما وليهم إثنا عشرة رجلاً' (ان لوگوں کی حکومت اس وقت تک جاری رہے گی، جب تک ان پر بارہ آدمی ولی ہوں گے) کے الفاظ، مسلم، رقم ۱۸۲۱ د میں 'لا يزال الإسلام عزيزًا إلى إثنى عشرة خليفة' (اسلام بارہ حکمرانوں تک غالب رہے گا) کے الفاظ، مسلم، رقم ۱۸۲۱ ہ میں 'لا يزال هذا الأمر عزيزًا إلى إثنى عشرة خليفة' (یہ حکومت بارہ حکمرانوں تک مضبوط ہوتی رہی گی) کے الفاظ اور مسلم، رقم ۱۸۲۱ و میں 'لا يزال هذا الدين عزيزًا منيعًا إلى إثنى عشر خليفة' (یہ دین بارہ حکمرانوں تک مضبوط ہوتا رہے گا اور (تمام جارحیت کے خلاف) دفاع کرتا رہے گا) کے الفاظ روایت کیے گئے ہیں۔ ابوداؤد، رقم ۴۲۷۹ میں 'لا يزال هذا الدين قائمًا حتى يكون عليكم إثنا عشرة خليفة' (تم پر بارہ حکمران آنے تک یہ دین قائم رہے گا) کے الفاظ روایت کیے گئے ہیں، جبکہ بعض روایات، مثلاً احمد، رقم ۲۰۸۲۴ میں 'هذا' (یہ) اور 'عـليكم' (تم پر) کے الفاظ محذوف ہیں۔ ابوداؤد، رقم ۴۲۸۰ میں 'لا يـزال هذا الدين عـزيزًا إلى إثنى عشرة خليفة' (یہ دین بارہ حکمرانوں تک مضبوط رہے گا) کے الفاظ روایت کیے گئے ہیں۔ ترمذی، رقم ۲۲۲۳ میں 'يـكون من بعدي إثنا عشرة أميرًا' (میرے بعد بارہ امیر ہوں گے) کے الفاظ روایت کیے گئے ہیں، جبکہ بعض روایات، مثلاً احمد، رقم ۲۰۸۹۰ میں لفظ 'من' محذوف ہے اور بعض روایات، مثلاً ابن

حبان، رقم ۶۶۶۱ میں لفظ 'أمیر' (سردار) کے بجاے اس کا مترادف 'خلیفة' (حکمران) آیا ہے۔ احمد، رقم ۲۰۸۳۳ میں 'إن هذا الدین لن یزال ظاهرًا علی من ناوأه لا یضره مخالف ولا مفارق حتی یمضی من أمتی إثنا عشرة خلیفة' (بے شک، یہ دین اپنے دشمنوں پر ضرور غالب رہے گا، اس کے مخالفین اور اس کو تقسیم کرنے والے اس کو نقصان پہنچانے میں کامیاب نہیں ہوں گے، جب تک اس میں بارہ حکمران گزریں گے) کے الفاظ، احمد، رقم ۲۰۹۱۰ میں 'لا یزال هذا الأمر عزیزًا منیعًا ظاهرًا علی من ناوأه حتی یملك إثنا عشر' (یہ معاملہ مضبوط رہے گا، تمام جارحیت کے خلاف دفاع کرے گا اور بارہ (حکمرانوں) تک اپنے دشمنوں پر غالب رہے گا) کے الفاظ، احمد، رقم ۲۰۹۷۴ میں 'لن یزال هذا الأمر عزیزًا ظاهرًا حتی یملك إثنا عشر' (معاملات کی یہ موجودہ حالت بارہ حکمرانوں کے عہدہ لینے تک یقیناً مضبوط اور غالب رہے گی) کے الفاظ، احمد، رقم ۲۰۹۴۳ میں 'لن یزال هذا الدین عزیزًا منیعًا ظاهرًا علی من ناوأه لا یضره من فارقه أو خالفه حتی یملك إثنا عشر' (یہ دین بارہ حکمرانوں کے عہدہ لینے تک یقیناً مضبوط رہے گا، تمام جارحیت کے خلاف دفاع کرے گا، اپنے دشمنوں پر غالب رہے گا، اس کو ٹکڑے کرنے کی خواہش رکھنے والے یا وہ جو اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، وہ اس کو نقصان پہنچانے کے قابل نہیں ہوں گے) کے الفاظ، احمد، رقم ۲۰۹۶۰ میں 'لا یزال هذا الأمر صالحًا حتی یکون إثنا عشر أمیرًا' (معاملات کی یہ موجودہ حالت دس حکمرانوں تک درست رہے گی) کے الفاظ اور احمد، رقم ۲۰۹۶۱ میں 'لا یزال هذا الأمر ماضیًا حتی یقوم إثنا عشر أمیرًا' (معاملات کی یہ موجودہ حالت بارہ سرداروں تک بلا تعطل رہے گی) کے الفاظ روایت کیے گئے ہیں، جبکہ بعض روایات، مثلاً احمد، رقم ۲۰۹۹۹ میں اسی طرح کے الفاظ روایت کیے گئے ہیں، سوائے اس کے کہ لفظ 'أمیر' (سردار) کے بجاے اس کا مترادف 'خلیفة' (حکمران) آیا ہے۔ احمد، رقم ۲۰۹۶۲ میں 'لا یزال الناس بخیر إلی إثنی عشر خلیفة' (بارہ حکمرانوں تک لوگ خیریت سے رہیں گے) کے الفاظ، احمد، رقم ۲۰۹۶۴ میں 'لا یزال هذا الأمر عزیزًا منیعًا ینصرون علی من ناوأهم علیه إلی إثنی عشر خلیفة' (معاملات کی یہ موجودہ حالت بارہ حکمرانوں تک مضبوط رہے گی، تمام جارحیت کے خلاف دفاع کرے گی، اس پر حملہ کرنے والوں پر فاتح ہوگی) کے الفاظ، احمد، رقم ۲۱۰۵۱ میں 'یکون لهذه الأمة إثنا عشر خلیفة' (اس امت میں بارہ حکمران ہوں گے) کے الفاظ، احمد، رقم ۲۱۰۷۱ میں 'لا یزال هذا الأمر مؤاتًی أو مقاربًا حتی یقوم إثنا عشر خلیفة'

(معاملات کی یہ موجودہ حالت بارہ گورنر حکمرانوں تک پرامن یا اس کے قریب رہے گی) کے الفاظ اور مسلم، رقم ۱۸۲۲ میں 'لا يزال الدين قائمًا حتى تقوم الساعة أو يكون عليكم إثنا عشر خليفة' (یہ دین قیام قیامت تک مضبوط رہے گا یا جب تک ان پر بارہ حکمران رہیں گے) کے الفاظ روایت کیے گئے ہیں۔

بعض روایات، مثلاً ابوداؤد، رقم ۴۲۸۱ میں راوی مزید روایت کرتے ہیں:

فلما رجع إلى منزله أتته قريش فقالوا: ثم يكون ماذا؟ قال: ثم يكون الهرج.	''جب آپ (نبی صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے گھر واپس آئے تو قریش کے کچھ لوگ آپ کے پاس آئے اور آپ سے پوچھا: اس کے بعد کیا ہوگا؟ آپ نے جواب دیا: پھر انتشار ہوگا۔''

جبکہ بعض روایات، مثلاً احمد، رقم ۲۰۸۲۴ میں روایت کیا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لا يزال الدين قائمًا حتى يكون إثنا عشر خليفة من قريش ثم يخرج كذابون بين يدي الساعة.	''جب تک قریش کے بارہ حکمران ہوں گے، یہ دین قائم رہے گا۔ پھر قیامت سے پہلے کذاب ظاہر ہوں گے۔''

''...جن لوگوں کے اندر نفسانی کدورتیں ہوتی ہیں اگر وہ کسی مجلس میں مجتمع ہوتے بھی ہیں تو ایک دوسرے سے منہ پھیر کر بیٹھتے ہیں لیکن اللہ سے ڈرنے والوں میں اول تو نفسانی کدورتیں ہوتی ہی نہیں اور اگر تاویل واجتہاد، رائے وقیاس اور رجحان و ذوق کے کسی اختلاف کے باعث ان کے اندر کوئی شکر رنجی ہوتی بھی ہے تو کشف حقیقت کے بعد وہ بھی دور ہو جائے گی اور اللہ تعالیٰ اس کے اثرات سے بھی ان کے دلوں کو پاک کر دے گا اور وہ باہم بالکل شیر وشکر ہو کر ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل جائیں گے۔'' (تدبر قرآن ۴/۳۶۲)

محمد وسیم اختر مفتی

حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ

[''سیر وسوانح'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

حضرت مقداد کا شجرۂ نسب قحطان سے جاملتا ہے جو جنوبی یمن کے قبائل کے جد اعلیٰ تھے۔قحطان کی چوتھی نسل میں حمیر اور نویں میں قضاعہ ہوئے۔ بہرا بنوقضاعہ کی ایک شاخ تھی، حضرت مقداد اسی سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے بہرانی کہلاتے ہیں۔ان کے والد عمرو بن ثعلبہ (ایک روایت: مقداد) نے اپنی قوم کے ایک آدمی کو قتل کر دیا پھر بھاگ کر حضر موت چلے گئے اور قبیلۂ کندہ کے حلیف بن گئے تب وہ کندی اور حضرمی کی نسبتوں سے مشہور ہو گئے۔ عمرو نے کندہ کی ایک عورت سے شادی کی جس سے مقداد پیدا ہوئے۔مقداد بڑے ہوئے تو ان کا ابوشمر بن حجر کندی سے جھگڑا ہو گیا۔انھوں نے تلوار مار کر اس کا پاؤں کاٹ دیا اور بھاگ کر مکہ چلے گئے اور بنوزہرہ کے اسود بن عبد یغوث کے حلیف بن گئے۔اسود نے خط لکھ کر عمرو کو بلایا اور مقداد کو متبنّٰی بنالیا۔چنانچہ وہ مقداد بن اسود زہری کے نام سے مشہور ہو گئے۔یہ روایت بھی موجود ہے کہ مقداد سیاہ فام تھے اور لے پالک بننے سے پہلے اسود کی غلامی میں تھے۔جب منہ بولے بیٹوں کے بارے میں اللہ کا یہ حکم نازل ہوا، ''اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَ هُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ۔انھیں ان کے (حقیقی) باپوں کے نام سے پکارو، یہی اللہ کے ہاں زیادہ قرین انصاف ہے۔اور اگر تمھیں ان کے آبا کا علم ہی نہ ہو تو تمھارے دینی بھائی اور تعلق دار ہیں۔(الاحزاب ۳۳: ۵) تو انھیں مقداد بن عمرو کہا جانے لگا تاہم ان کی پہلی شہرت برقرار رہی۔

مقداد کی کنیت ابوعمر یا ابومعبد یا ابواسود تھی۔حضرت مقداد ''السابقون الاولون'' میں سے تھے، لیکن شروع میں

انھوں نے اپنا ایمان پوشیدہ رکھا۔ معلوم نہیں کہ پہلے پچاس مسلمانوں میں ان کا کون سا نمبر تھا تاہم، یہ واضح ہے کہ قبول اسلام کے وقت ان کی عمر چوبیس برس تھی۔ اسلام کی طرف ان کی سبقت اس روایت سے خوب ظاہر ہو جاتی ہے جو عبداللہ بن مسعود نے روایت کی، جن اہل ایمان نے سب سے پہلے اپنے ایمان کا اعلان کیا، سات تھے۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکر، عمار، سمیہ، صہیب، بلال اور مقداد (دوسری روایت خباب)۔ آپ کی حفاظت اللہ نے آپ کے چچا ابوطالب کے ذریعے سے کی، سیدنا ابوبکر کے دفاع کا ذریعہ ان کی قوم بنی، باقی پانچوں کو مشرکین لوہے کی زرہیں پہنا کر دھوپ کی تپش دیتے۔ (مقدمۂ ابن ماجہ، رقم ۱۵۰، مسند احمد، رقم ۳۸۳۲)

حضرت مقداد کی شادی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چچا زاد بہن ضباعہ سے ہوئی۔ وہ زبیر بن عبدالمطلب کی بیٹی تھیں۔ ان دونوں کی شادی کا قصہ یوں بیان کیا جاتا ہے، ایک بار حضرت مقداد اور حضرت عبدالرحمان بن عوف اکٹھے بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت عبدالرحمان نے مقداد سے کہا، تم شادی کیوں نہیں کر لیتے؟ مقداد نے جواب دیا، آپ اپنی بیٹی مجھ سے بیاہ دیں۔ عبدالرحمان غصے میں آ گئے اور مقداد کو برا بھلا کہا۔ مقداد نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کی شکایت کی تو آپ نے فرمایا، میں تمھارا بیاہ کر دیتا ہوں۔ چنانچہ آپ نے ضباعہ سے ان کا نکاح کر دیا۔ وہ خوب صورت ہونے کے ساتھ ذہین بھی تھیں۔

حضرت مقداد کو مہاجر الہجرتین کہا جاتا ہے، کیونکہ انھیں حبشہ و مدینہ، دونوں شہروں کی طرف ہجرت کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ ۵ نبوی میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود انھیں حبشہ جانے کا مشورہ دیا۔ آپ نے فرمایا، وہاں ایسا حکمران ہے جو اپنی سلطنت میں ظلم روا نہیں رکھتا۔ مقداد جعفر بن ابوطالب کے ساتھ کشتی میں سفر کرنے والے سڑسٹھ مسلمانوں میں شامل تھے، یہ ہجرت ثانیہ نہیں بلکہ پہلی ہجرت حبشہ کا دوسرا مرحلہ تھا۔ مقداد ہجرت مدینہ سے قبل ہی حبشہ سے مکہ لوٹ آئے۔ جب یہ افواہ پھیلی کہ قریش اسلام لے آئے ہیں تو تینتیس مسلمانوں کا ایک گروپ مکہ پہنچا۔ سیدنا عثمان بن عفان، سیدنا زبیر بن عوام، سیدنا عبدالرحمان بن عوف، سیدنا مصعب بن عمیر اور سیدنا مقداد بن اسود ان میں شامل تھے۔ اس خبر کے غلط ثابت ہونے پر کچھ مہاجرین حبشہ واپس چلے گئے، یہ ہجرت ثانیہ تھی۔ چند اصحاب مکہ ٹھہر گئے، مقداد انھی میں سے ایک تھے۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ ہجرت کی، مقداد نہ جا سکے۔ شوال ۱ھ (دوسری روایت، ربیع الاول ۲ھ) میں آپ نے عبیدہ بن حارث کی قیادت میں ساٹھ سے زائد مہاجرین کا سریہ بطن رابغ کی طرف روانہ فرمایا۔ یہ جحفہ کے قریب واقع مقام ثنیۃ المرہ تک پہنچا تھا کہ دو سو افراد پر مشتمل قریش کے ایک بڑے قافلے سے اس کی مڈبھیڑ

ہوئی جو ابوسفیان (یا عکرمہ بن ابوجہل) کی قیادت میں سفر کر رہا تھا۔لڑائی تو نہ ہوئی تاہم حضرت سعد بن ابی وقاص نے ایک تیر برسایا جو راہ خدا میں چلایا جانے والا پہلا تیر تھا۔مشرکین کے قافلے سے مقداد بن عمرو (مقداد بن اسود) اور عتبہ بن غزوان بھاگ کر مسلمانوں سے آ ملے۔یہ دونوں مسلمان تھے،لیکن مدینہ پہنچنے کے لیے کفار کے قافلے میں شامل ہو گئے تھے۔

مدینہ تشریف لانے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین کو دس دس کی ٹکڑیوں میں بانٹ دیا پھر ہر ٹکڑی کو رہنے کے لیے ایک گھر دیا،حضرت مقداد ان صحابہ میں شامل تھے جو آپ کے ساتھ رہ رہے تھے۔خود بیان کرتے ہیں، میں دو اصحاب کی معیت میں ہجرت کر کے مدینہ آیا۔کسی نے ہماری مہمانی نہ کی تو ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔آپ ہمیں اپنے گھر لے گئے،وہاں چار بکریاں (مسلم: تین،مسند احمد،ایک روایت: ایک بکری) بندھی تھیں۔فرمایا،مقداد! ان کا دودھ دوہ لو اور ہر ایک کو اس کا حصہ دے دو۔چنانچہ دودھ دوہ کر تقسیم کرنا میرا معمول بن گیا۔آپ روزانہ رات کو تشریف لاتے،مسجد جا کر نماز پڑھتے اور دودھ نوش فرما لیتے۔ایک روز میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ نکال کر رکھا اور بستر پر لیٹ گیا۔پھر شیطان نے مجھ پر غلبہ پا لیا،سوچا کہ آپ تو انصار کے ہاں گئے ہوئے ہیں،آپ کا حصہ میں ہی پی لیتا ہوں۔دودھ پی چکا تو پریشانی لاحق ہو گئی کہ آپ بھوکے پیاسے آئیں گے اور برتن کو خالی پائیں گے۔میں اپنی اونی چادر منہ پر ڈال کر پڑا تھا کہ آپ آئے،آہستہ سے سلام کیا تاکہ جاگتا ہوا سن لے اور سوئے ہوئے کی نیند خراب نہ ہو۔نماز پڑھ کر دودھ کا برتن خالی دیکھا تو دعا فرمائی،اللہ! جو مجھے پلائے، اسے سیر کر دے اور جو کھلائے اس کا پیٹ بھر دے۔آپ کی دعا کو میں نے غنیمت سمجھا،اٹھا،چھری پکڑی اور بکریوں کی طرف بڑھا۔ان کو ٹٹولا،کون سی زیادہ فربہ ہے کہ اسے ذبح کر لوں۔اچانک میرا ہاتھ ایک کے پستان پر پڑا،معلوم ہوا کہ دودھ سے بھرا ہے۔باقی دونوں کو ہاتھ لگایا تو وہ بھی پُر تھے چنانچہ دودھ دوہ کر آپ کی خدمت میں پیش کر دیا۔آپ نے پوچھا،مقداد! کیا کوئی غلط بات کر دی ہے؟ میں نے کہا،آپ پی لیں،پھر بتاتا ہوں۔آپ نے مجھے بھی لینے کو کہا تو میں نے کہا،آپ ہی نوش فرما لیں۔آپ سیر ہو گئے تو باقی دودھ مجھے دے دیا۔میں نے سارا قصہ سنایا۔فرمایا،یہ برکت ہے جو اللہ کی طرف سے آسمان سے اتری ہے۔تم بتاتے تو تمھارے دونوں ساتھیوں کو جگا کر ان کو بھی پلا دیتا۔(مسلم،رقم ۵۴۱۲،مسند احمد،رقم ۲۳۸۱۲) مسند احمد کی روایت ۲۳۸۱۸ میں ہے کہ آپ نے مقداد کو بکری ذبح کرنے سے منع کیا اور اس کے پستان پر ہاتھ پھیرا تو وہ دودھ سے لبالب بھر گیا۔عاصم کی روایت کے مطابق مقداد مدینہ میں کلثوم بن ہدم کے مہمان ہوئے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقداد کی مواخات جبار بن صخر

(دوسری روایت: ابوذر غفاری، تیسری روایت: عبداللہ بن رواحہ) سے قائم فرمائی۔ آپ نے ابی بن کعب کے مشورہ پر مقداد کو بنوحُدیلہ میں زمین عنایت فرمائی، ابی کا تعلق اسی قبیلہ سے تھا۔

۲ھ (ذی قعدہ ۱ھ) میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اکیس صحابہ کا ایک سریہ خرار کی طرف روانہ فرمایا۔ انھیں قریش کے ایک قافلے کا راستہ روکنا تھا۔ آپ نے حضرت سعد بن ابی وقاص کو امیر بنایا اور حضرت مقداد بن اسود کو سفید پرچم عطا کیا۔ مسلمان پانچ دن کے بعد پیدل سفر کے بعد منزل مقصود پر پہنچے تو پتا چلا کہ مشرکین کا قافلہ ایک روز پہلے یہاں سے جا چکا ہے۔ آپ نے خرار سے آگے نہ جانے کی ہدایت فرمائی تھی اس لیے یہ دستہ لوٹ آیا۔

حضرت مقداد نے جنگ بدر اور بعد کے تمام غزوات میں بھرپور حصہ لیا۔ رمضان ۲ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوسفیان کی قیادت میں شام سے لوٹنے والے قریش کے تجارتی قافلے کو روکنے کا ارادہ کیا۔ ابوسفیان نے راستہ بدل لیا اور مدینہ سے ہٹ کر ساحل سمندر کی طرف نکل گیا۔ اسی اثنا میں قریش کا ایک بڑا لشکر قافلے کا دفاع کرنے کے لیے مکہ سے چل پڑا۔ آپ نے جوابی کارروائی کرنے کے لیے صحابہ سے مشورہ فرمایا۔ سیدنا ابوبکر و عمر نے حمایت اور جاں نثاری کا خوب یقین دلایا۔ حضرت مقداد نے تقریر کرتے ہوئے کہا، ''یا رسول اللہ! اللہ کی طرف سے آپ کو جو حکم ہوا ہے، کر گزریے۔ واللہ! ہم آپ کو وہ جواب نہ دیں گے جو بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام کو دیا تھا، 'فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ'۔ ''جاؤ! تم اور تمھارا رب مل کر لڑ لو، ہم یہاں بیٹھے ہوئے ہیں'' (المائدہ ۵: ۲۴)۔ ہم تو کہتے ہیں، جایئے! آپ اور آپ کا رب مل کر لڑیں۔ ہم بھی آپ کے شانہ بشانہ لڑیں گے۔ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، اگر آپ ہمیں برک غماد (مکہ سے بھی آگے ساحل سمندر پر واقع ایک مقام یا یمن کی دور دراز کی ایک بستی) تک لے جانا چاہیں تو بھی ہم آپ کے شانہ بشانہ تلوار زنی کرتے چلیں گے اور آپ کو وہاں تک پہنچا کر دم لیں گے۔ ہم آپ کے دائیں بائیں ہو کر قتال کریں گے، آپ کے آگے پیچھے ہو کر لڑیں گے یہاں تک کہ اللہ آپ کو فتح دے دے۔'' آپ نے انھیں خیر و برکت کی دعا دی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں، ''میں نے اس موقع پر مقداد کا وہ رنگ دیکھا کہ اب یہ حسرت مجھے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ محبوب ہو گئی ہے، کاش یہ سب ان کے بجائے میں نے کہا ہوتا۔ میں نے دیکھا کہ مقداد کی تقریر سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مسرت سے دمک اٹھا۔'' (بخاری، رقم ۳۹۵۲، ۴۶۰۹) انصار کی طرف سے حضرت سعد بن معاذ نے بھی ایسے ہی کلمات کہے۔

حضرت مقداد کو اللہ کی راہ میں قتال کرنے والے پہلے گھڑ سوار کا شرف حاصل ہوا۔ سیدنا علی کہتے ہیں، جنگ بدر

میں مقداد اکیلے شاہ سوار تھے، ان کے علاوہ کسی کے پاس گھوڑا نہ تھا۔ (نسائی، رقم ۸۲۳، مسند احمد، رقم ۱۰۲۳، ۱۳۸) سیدنا علی ہی سے مروی دوسری روایت ہے، (قریش کے سوگھوڑوں کا مقابلہ کرنے کے لیے) ہماری فوج میں دو ہی گھوڑے تھے، سیدنا زبیر کا اور حضرت مقداد بن اسود کا۔ (دلائل النبوہ، بیہقی ۳۹/۳) مقداد میسرہ پر متعین تھے، ان کا گھوڑا اچتکبرا تھا، اس کا نام سبحہ (لمبی سیر) یا بعزجہ تھا۔ زبیر کے پاس اسلامی فوج کے میمنہ کی کمان تھی، ان کے گھوڑے کا نام یعسوب (شہد کی مکھیوں کا سردار، گھوڑے کی پیشانی کی سفیدی) تھا۔ سعد بن خیثمہ اور مصعب بن عمیر بھی باری باری انھی دو گھوڑوں پر سوار ہو کر لڑتے رہے۔ (دلائل النبوہ، بیہقی ۱۱۰/۳) تیسری روایت بیان کرتی ہے، اس معرکۂ فرقان میں دو گھوڑوں نے حصہ لیا، ایک، مقداد بن اسود کا سبحہ، دوسرا اسبل نامی جو مرثد بن ابو مرثد کے پاس تھا۔ (ابن سعد) مقداد نے جنگ بدر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کٹر دشمن نضر بن حارث کو قید کیا۔ آپ نے اس کی گردن اڑانے کا حکم دیا تو سیدنا علی نے اثیل لے جا کر اس کو قتل کیا۔ ایک روایت کے مطابق اس معرکے میں مقداد (دوسری روایت: بلال) نے زید بن ملیص کو قتل کیا۔

جنگ احد میں حضرت زبیر بن عوام گھڑ سواروں کے قائد تھے، حضرت مقداد بن اسود ان کے ساتھ تھے۔ دوسری روایت کے مطابق مقداد کے پاس پیادہ فوج کی کمان تھی۔

جنگ احد اور جنگ خندق میں مقداد نے خوب تیر اندازی کی۔

۶ھ غزوۂ ذی قرد: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مال فے کے اونٹ بنوغفار کے گلہ بان کی نگرانی میں جنگل میں چر رہے تھے، اس کی بیوی ساتھ تھی۔ بنوفزارہ کے عیینہ بن حصن (طبری: عبدالرحمان بن عیینہ) نے بنوغطفان کے کچھ گھڑ سواروں کے ساتھ مل کر غارت گری کی، چرواہے کو مار ڈالا، اس کی بیوی کو پکڑ لیا اور اونٹوں کو ہانک کر لے گئے۔ اتفاق سے سلمہ بن اکوع اور طلحہ بن عبیداللہ کا غلام وہاں سے گزرے اور کفار کے گھوڑوں کو جاتے دیکھ لیا۔ وہ مدینہ کے قریب واقع جبل سلع پر چڑھ گئے اور مدد کی پکار دی، واصباحاہ! ہائے صبح کی غارت گری! پھر لٹیروں کا پیچھا کیا اور بے مثال تیر اندازی کر کے اونٹ چھڑا لیے۔ سلمہ کی پکار سن کر مدینہ کے شہ سوار بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جمع ہو گئے۔ سب سے پہلے مقداد بن اسود پہنچے، پھر عباد بن بشر، سعد بن زید، اسید بن ظہیر، عکاشہ بن محصن، محرز بن نضلہ، حارث بن ربعی اور عبید بن زید آ گئے۔ (ابن ہشام) آپ نے سعد بن زید کو امیر مقرر کر کے اس دستے کو حملہ آوروں کے پیچھے بھیجا۔ اونٹ مدینہ پہنچے تو آپ نے صحابہ میں بانٹ دیے۔ غزوہ کے بعد حسان بن ثابت نے مقداد کی مدح میں اشعار کہے تو قائد سریہ سعد بن زید ان سے ناراض ہو گئے۔ تب انھوں نے سعد کے لیے الگ شعر

کہے۔ سلمہ بن اکوع کہتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھیجے ہوئے دستے میں سے اخرم اسدی سب سے پہلے پہنچے پھر ابوقتادہ انصاری اور مقداد بن اسود آئے۔ (مسلم، رقم ۴۷۰۲، مسند احمد، رقم ۱۶۵۳۹)

۷ھ حضرت مقداد نے جنگ خیبر میں حصہ لیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر سے حاصل ہونے والے غلے میں سے ازواج مطہرات اور فاطمہ زہرا کے حصے لکھوائے تو مقداد اور اسامہ کے حصے بھی تحریر کیے گئے۔ عثمان اور عباس نے گواہی ثبت کی۔ مال غنیمت میں سے مقداد کو ملنے والے پندرہ وسق (ایک وسق: ساٹھ صاع، پندرہ وسق: پندرہ اونٹوں پر آنے والا غلہ) جو معاویہ نے ایک لاکھ درہم میں خرید لیے۔

۸ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کی مہم پر جانے کا ارادہ کیا۔ حاطب بن ابی بلتعہ نے اطلاع کا خط لکھ کر ایک باندی کے ذریعے قریش کو بھیج دیا۔ آپ کو فوراً وحی سے خبر ہو گئی، آپ نے علی، زبیر اور مقداد کو روانہ کیا اور فرمایا: ''مدینہ و مکہ کے مابین واقع جگہ روضۂ خاخ پہنچو گے تو تمھیں اونٹ کے ہودے میں سوار ایک عورت ملے گی۔ اس کے پاس خط ہو گا، وہ لے لینا۔'' دونوں اصحاب وہ خط لے کر آپ کے پاس پہنچے تو عمر نے حاطب کا سر قلم کرنا چاہا، لیکن آپ نے بدری ہونے کی وجہ سے انھیں چھوڑ دیا۔ حاطب نے بھی کہا کہ انھوں نے اسلام کو نقصان پہنچانے کے لیے بلکہ مشرکوں کے ہاں موجود اپنی والدہ اور دوسرے اعزہ کو بچانے کے لیے ایسا کیا۔ (بخاری، رقم ۳۰۰۷، مسلم، رقم ۶۴۸۵)

۸ھ، فتح مکہ کے موقع پر مقداد کے پاس جیش نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے میمنہ کی کمان تھی۔

۹ھ، عام الوفود: تیرہ ارکان پر مشتمل قبیلۂ بہرا کا وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے مدینہ آیا تو اپنے ہی قبیلے سے تعلق رکھنے والے مقداد بن عمرو (اسود) کا مہمان ہوا۔

ایک بار اقرع بن حابس تمیمی اور عیینہ بن حصن فزاری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے آئے تو دیکھا کہ چند غریب اہل ایمان آپ کے ہم نشین ہیں۔ اپنے اپنے قبیلے کے ان سرداروں نے ان مسکینوں کو نظر حقارت سے دیکھ کر مطالبہ کیا، ہم آئیں تو آپ ان کے پاس سے اٹھ جائیں۔ آپ اس بات پر آمادہ ہوئے تھے کہ جبریل علیہ السلام وحی لے کر نازل ہوئے:

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ، مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ

(اے نبی!) ان لوگوں کو نہ دھتکاریے جو اپنے رب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے صبح و شام اسے پکارتے ہیں۔ ان کے حساب میں سے آپ پر کچھ عائد نہیں ہوتا اور آپ کے اسوۂ حسنہ کی ان پر کوئی

الظّٰلِمِيْنَ. (الانعام ٦: ٥٢)

ذمہ داری نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ انھیں دھتکار کر آپ ظالموں میں شامل ہو جائیں۔''

مشہور روایت ہے کہ یہ غربا صہیب، بلال، عمار اور خباب تھے، لیکن ابن ماجہ کی روایت (۴۱۲۸) میں خباب کی بجاے مقداد بن اسود کا ذکر ہے، اس میں سعد اور عبداللہ بن مسعود کا اضافہ بھی ہے۔

ایک بار مقداد رفع حاجت کے لیے مدینہ کے غیر آباد مقام بقیع خبخبہ (خجبہ یا جبجہ) گئے۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک چوہا ایک بل سے دینار باہر نکال رہا ہے۔ وہ ایک ایک کر کے دینار نکالتا رہا حتیٰ کہ سترہ دینار ہو گئے۔ پھر اس نے ایک سرخ کپڑا (تھیلی) نکالا جس میں ایک دینار بچا تھا۔ اٹھارہ دینار ہو گئے تو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گئے اور کہا، اس کی زکوٰۃ لے لیجیے۔ آپ نے پوچھا، کیا تو سوراخ میں جھکا تھا (یا اس میں ہاتھ ڈالا تھا)؟ مقداد نے جواب دیا، نہیں۔ فرمایا، اللہ تمھیں اس مال میں برکت دے، تم پر صدقہ واجب نہیں۔ (ابوداؤد، رقم ۳۰۸۷، ابن ماجہ، رقم ۲۵۰۷)

۲۵ ذی قعد ۱۰ھ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سفر حجۃ الوداع پر روانہ ہوئے۔ (مدینہ سے چھ میل باہر) مدینہ کے میقات ذوالحلیفہ پہنچ کر آپ نے ارشاد فرمایا، جو حج (قران) کا احرام باندھنا چاہتے ہیں، حج کی نیت کر لیں اور جو عمرہ (کر کے حج تمتع) کرنا چاہتے ہیں، عمرہ کی نیت کر لیں۔ اسماء بنت ابوبکر کہتی ہیں، میں، عائشہ، مقداد اور زبیر ان لوگوں میں شامل تھے جنھوں نے عمرہ (حج تمتع) کی نیت سے احرام باندھا۔ (مسند احمد، رقم ۲۲۹۶۲) اس حدیث کی سند میں ضعف ہے۔

۱۱ھ، یعقوبی کے بیان کے مطابق مہاجرین میں سے عباس، فضل بن عباس، زبیر بن عوام، خالد بن سعید، مقداد بن اسود، سلمان فارسی، ابوذر غفاری، عمار بن یاسر، برا بن عازب اور ابی بن کعب نے خلیفۂ اول ابوبکر کی بیعت نہ کی۔ اہل سنت علما کا اصرار ہے، سیدنا علی اور سیدنا زبیر سمیت تمام صحابہ نے بالاتفاق ابوبکر کی بیعت کر لی۔ چھ ماہ گزرنے کے بعد علی کی جس بیعت کا ذکر آتا ہے، وہ ان کی بیعت ثانیہ ہے جو میراث کے مسئلہ پر ابوبکر اور فاطمہ میں ہونے والی شکر رنجی دور کرنے کے لیے کی گئی۔

حضرت مقداد بن اسود نے جنگ یرموک (۱۳ھ: طبری، ابن کثیر، رجب ۱۵ھ: ابن عساکر) میں بھی شرکت کی۔ وہ ہر فوجی کے پاس جاتے اور سورۂ انفال اور جہاد کے بارے میں نازل ہونے والی آیات پڑھ کر سناتے۔ وہ حمص کے محاصرہ (۱۵ھ) میں ابوعبیدہ بن جراح کے ساتھ تھے۔ محاصرہ ختم ہونے کے بعد ابوعبیدہ نے انھیں بلی بھیج دیا۔ ۲۰ھ میں انھوں نے فتح مصر کی مہم میں حصہ لیا۔ ابوراشد حرانی کہتے ہیں، میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پہرے دار مقداد بن اسود کو حمص میں سنار کے ایک بکس پر اس طرح بیٹھے ہوئے دیکھا کہ لحیم شحیم ہونے کی وجہ سے ان کا جسم لٹک رہا تھا۔ وہ جنگ میں جانے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ میں نے کہا، اللہ نے آپ کو صاحب عذر قرار دیا

ہے۔ جواب دیا، مجھے سورۂ بحوث (سورۂ توبہ) کی اس آیت نے بیٹھنے نہیں دیا' انفروا خفافاً و ثقالاً و جاھدوا باموالکم و انفسکم فی سبیل اللّٰہ ' ۔نکل آؤ، تھوڑا مال رکھتے ہو یا زیادہ اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جانوں سے جہاد کرو۔ (مستدرک حاکم، رقم ۵۴۸۷)

۲۰ھ، عہد فاروقی میں عبداللہ بن عمر، زبیر بن عوام اور مقداد بن اسود غنیمت میں ملنے والے مال مویشیوں کی خبر لینے خیبر گئے۔ اس موقع پر یہودیوں نے بدعہدی کی، انھوں نے عبداللہ بن عمر پر اس وقت حملہ کیا جب وہ سوئے ہوئے تھے۔ مار پیٹ کر ان کے کہنیوں کے جوڑ اتار دیے۔ تب یہودیوں کی اس مسلسل عہد شکنی پر سیدنا عمر نے انھیں مدینہ سے نکال باہر کیا۔ (مسند احمد، رقم ۹۰)

خلیفۂ دوم حضرت عمر بن خطاب کی تدفین کے بعد نئے خلیفہ کے انتخاب کے لیے ان کی مقرر کردہ مجلس شوریٰ کا اجلاس منعقد ہوا۔ عمر کی وصیت کے مطابق مقداد بن اسود نے اراکین شوریٰ کو مسور بن مخرمہ کے گھر جمع کیا۔ پھر وہ چلے گئے اور سیدنا عمر ہی کی ہدایت کے مطابق ابوطلحہ انصاری اور ان کے ساتھیوں نے پہرہ دیا۔ انتخاب عثمان اور علی کے بیچ معلق ہوا اور عبدالرحمان بن عوف پر فیصلے کی ذمہ داری آئی تو انھوں نے عامۃ المسلمین سے فرداً فرداً مشورہ کیا۔ مقداد بن اسود سے پوچھا تو انھوں نے علی کے حق میں ووٹ دیا۔ شیعہ محدث کلینی کا کہنا ہے، مقداد نے خلافت اہل بیت کو دینے پر زور دیا۔

قبرص عہد عثمانی میں ۲۷ھ (دوسری روایت: ۲۸ھ) میں فتح ہوا۔ قبرص پر حملے میں مقداد بھی شریک تھے۔

ایک شخص خلیفۂ سوم سیدنا عثمان کے پاس آ کر ان کی مدح سرائی کرنے لگا۔ حضرت مقداد پاس تھے، آگے بڑھے، گھٹنے موڑ کر بیٹھ گئے اور اس کے منہ پر مٹی کنکر ڈالنے لگے۔ سیدنا عثمان نے پوچھا، یہ کیا؟ مقداد نے جواب دیا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں کثرت سے تعریف کرنے والوں کے منہ پر خاک ڈالنے کا حکم دیا ہے۔ (مسلم، رقم ۷۶۱۶) حضرت مقداد سیدنا علی کے بہت قریب تھے، دونوں کی آرا اور خیالات ملتے تھے۔ سیدنا علی کہتے ہیں، میں ایسا شخص تھا جسے مذی (pre-seminal fluid) بہت آتی تھی، ہر بار غسل کرتا جس سے میری کمر دکھنا شروع ہو گئی۔ (ابوداؤد، رقم ۲۰۶) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا داماد ہونے کی وجہ سے یہ مسئلہ آپ سے پوچھ نہ سکتا تھا، اس لیے مقداد (عمار بن یاسر، نسائی، رقم ۱۵۵) کو کہا۔ ان کے سوال پر آپ نے ارشاد فرمایا: ''یہ مرد کا پانی ہے، ہر مرد کو مذی آتی ہے۔ ذکر اور خصیوں (testicles & penis) کو دھو لو اور وضو کر لو۔'' (بخاری، رقم ۲۶۹، مسند احمد، رقم ۱۲۳۸)

خلیفۂ سوم حضرت عثمان حج قران (ایک ہی احرام سے عمرہ و حج کرنا) کرنے سے منع کرتے تھے۔ مقداد بن اسود اس بات کی شکایت لے کر سیدنا علی کے پاس آئے۔ وہ مدینہ کے کنویں سقیا پر اپنے اونٹوں کو پتے کھلا رہے تھے اور آٹا ملا

پانی پلا رہے تھے۔ مقداد نے کہا، دیکھیں! یہ عثمان بن عفان حج وعمرہ میں قران کرنے سے روکتے ہیں۔ سیدنا علی اسی حالت میں کہ ان کے ہاتھوں اور بازوؤں پر آٹا اور پتے لگے ہوئے تھے، حضرت عثمان کے پاس چلے آئے اور کہا، آپ حج قران سے روکتے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا، یہ میری فقہی رائے ہے۔ سیدنا علی غصے سے یہ پکارتے ہوئے لوٹ آئے، 'لبيك اللّٰهم لبيك بحجة وعمرة معا'۔ (موطا امام مالک، رقم ۶۹۲)

حضرت مقداد کا حلیہ ان کی بیٹی کریمہ نے یوں بیان کیا ہے، مقداد لانبے، گندم گوں اور سرخی مائل تھے۔ سر کے بال گھنے اور ابرو ملے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ ڈاڑھی بہت بڑی تھی نہ چھوٹی، اس پر زرد رنگ لگاتے۔

حضرت مقداد کی وفات عہد عثمانی (۳۳ھ) میں مدینہ سے تین (یا آٹھ) میل دور واقع مقام جرف میں ان کی اراضی پر ہوئی۔ مقداد کا پیٹ بڑا تھا۔ ان کے رومی غلام نے ان سے کہا، میں آپ کا پیٹ کاٹ کر اس میں سے چربی نکال دیتا ہوں تو وہ ہلکا ہو جائے گا۔ اس نے چربی نکالنے کا آپریشن کیا اور پیٹ سی دیا، لیکن اسی سے ان کی وفات ہو گئی۔ غلام بھاگ نکلا۔ میت کو کندھوں پر رکھ کر مدینہ لایا گیا، نماز جنازہ عثمان نے پڑھائی اور جنت البقیع میں دفن کر دیا گیا۔ ان کی عمر ستر برس ہوئی۔ دوسری روایت کے مطابق ان کی وفات خروع کا تیل (ارنڈی کا تیل، castor oil) پینے سے ہوئی۔ مقداد کی وفات کے بعد عثمان ان کی مدح کرتے رہے۔

حضرت مقداد نے زبیر بن عوام کو اپنا وصی بنایا۔ انھوں نے حسن وحسین کے لیے اٹھارہ اٹھارہ ہزار درہم اور امہات المومنین میں سے ہر ایک کے لیے سات سات ہزار کی وصیت کی۔ ان سب نے یہ رقوم قبول کر لیں۔

حضرت مقداد کے بیٹوں نے علی ومعاویہ کشمکش میں سیدنا علی کا ساتھ دیا۔ ان کی ایک بیٹی کا نام کریمہ تھا جنھوں نے ان سے کئی روایات نقل کی ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ نے مجھے چار آدمیوں سے محبت کرنے کا حکم دیا اور کہا، میں بھی ان سے محبت کرتا ہوں۔ ''علی، مقداد، ابوذر اور سلمان فارسی۔'' (ترمذی، رقم ۳۷۱۸، ابن ماجہ، رقم ۱۴۹، مسند احمد، رقم ۲۲۹۶۸) مسند احمد کی یہ روایت ضعیف اور منقطع ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کوئی نبی ایسا نہیں گزرا کہ اسے سات معزز رفقا و وزرا نہ دیے گئے ہوں جبکہ مجھے چودہ نقیبوں (سات قریش سے اور سات باقی مہاجرین میں سے) کی معیت حاصل ہے۔ ان کے نام یہ ہیں، حمزہ، جعفر، علی، حسن، حسین، ابوبکر، عمر، مقداد، عبداللہ بن مسعود، حذیفہ، سلمان، عمار، بلال اور ابوذر۔'' (رقم ۶۶۵، ۱۲۶۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار حضرت مقداد کو کسی مہم کا سربراہ بنا کر بھیجا۔ لوٹے تو دریافت فرمایا، تو نے امارت کیسی پائی؟ مقداد نے جواب دیا، مجھے یہی خیال آتا رہا

کہ سب ماتحت میرے غلام ہیں۔ واللہ! جب تک میں زندہ ہوں، کوئی منصب نہ سنبھالوں گا۔ (مستدرک حاکم، رقم ۵۴۸۸، حلیۃ الاولیا ۵۶۴) یہ خیال ان میں اتنا پختہ ہو گیا کہ نماز کی امامت کرنے کو کہا جاتا تو بھی انکار کر دیتے۔ (تہذیب التہذیب) انس بتاتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو بلند آواز سے تلاوت کرتے سنا تو فرمایا، خشیت الٰہی رکھنے والا ہے، وہ صحابی حضرت مقداد بن اسود تھے۔

ایک تابعی نے حضرت مقداد سے کہا، خوش بخت ہیں وہ آنکھیں جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا۔ ہماری دلی خواہش ہے کہ وہ کچھ دیکھ لیتے جو آپ لوگوں نے دیکھا اور ان مواقع پر، ان معرکوں میں موجود ہوتے جہاں آپ رہے۔ حضرت مقداد کو غصہ آ گیا، بولے، کیا معلوم، یہ آرزو رکھنے والا اس وقت ہوتا تو کس مقام پر ہوتا؟ ایسے لوگوں نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا جنھیں اللہ نے مونہوں کے بل دوزخ میں جھونک دیا، کیونکہ انھوں نے آپ کو مانا نہ تصدیق کی۔ تم اللہ کا شکر ادا نہیں کرتے کہ تمھاری آزمایش پہلوں نے جھیل لی، تم اللہ ہی کو مانتے ہو اور اس کے انبیا کو سچا جانتے ہو۔ آپ کے زمانے کا حال یہ تھا کہ آپ کے لائے ہوئے، حق و باطل کو ممیّز کرنے والے فرقان نے باپ بیٹے میں تفریق پیدا کر دی تھی۔ ایک شخص کا دل اللہ نے ایمان کے لیے کشادہ کر دیا ہوتا تھا، لیکن وہ دیکھتا تھا کہ اس کا باپ، بیٹا یا بھائی کفر میں مبتلا ہیں۔ اس کی آنکھوں کو ٹھنڈک کیسے مل سکتی تھی جب اس کے پیارے جہنم میں جانے والے تھے۔ (مسند احمد، رقم ۲۳۸۱۰)

حضرت مقداد بن اسود کا قول ہے، ''میں کسی شخص کے بارے میں اچھا برا کچھ نہیں کہتا یہاں تک کہ اس کا انجام نہ دیکھ لوں، کیونکہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد سن رکھا ہے، ابن آدم کا دل اس ہنڈیا سے بھی زیادہ الٹتا پلٹتا ہے جو خوب جوش کھا رہی ہوتی ہے۔'' (مسند احمد، رقم ۲۳۸۱۶، حلیۃ الاولیا ۵۶۶)

مشہور تابعی سائب بن یزید کہتے ہیں، میں طلحہ بن عبید اللہ، سعد بن ابی وقاص، مقداد بن اسود اور عبد الرحمان بن عوف کی صحبت میں رہا ہوں۔ میں نے کسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کرتے نہیں سنا سوائے اس کے کہ طلحہ جنگ احد کی باتیں بتاتے تھے۔ (بخاری، رقم ۲۸۲۴) صحابہ کا یہ طرز عمل احتیاط پر مبنی تھا تاہم مقداد نے بے شمار روایات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست روایت کیں۔ ان میں سے ایک بخاری میں اور چار مسلم میں شامل ہیں۔ ان سے روایت کرنے والوں میں شامل ہیں، علی، عبد اللہ بن مسعود، عبد اللہ بن عباس، انس، مستورد بن شداد، ابو ایوب انصاری، طارق بن شہاب، عبید اللہ بن عدی، ہمام بن حارث، عبد الرحمان بن ابو لیلیٰ، میمون بن ابو شبیب، سلیمان بن یسار، سلیم بن عامر، عمر بن اسحاق، جبیر بن نفیر، شریک بن سمی، حارث بن سوید، سائب بن یزید،

سعید بن عاص، عبداللہ بن سخبرہ، ان کی اہلیہ ضباعہ بنت زبیر اور بیٹی کریمہ بنت مقداد۔

مقداد سے مروی چند احادیث: میں نے نہیں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی لکڑی، ستون یا پتھر کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی ہو۔آپ اسے اپنے بائیں یا دائیں ابرو کے مقابل کر لیتے، بالکل سامنے نہ رکھتے۔ (ابوداؤد، رقم ۶۹۳) ایک بار مقداد نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا، ایک کافر مجھ سے جنگ کرتے ہوئے میرا ایک ہاتھ کاٹ دے پھر ایک درخت کی اوٹ لے کر کہے، میں مسلمان ہو گیا ہوں۔آپ کا کیا ارشاد ہے، میں اسے قتل کر دوں؟ فرمایا، نہیں۔مقداد نے پھر پوچھا، یا رسول اللہ! اس نے میرا ہاتھ کاٹ ڈالا ہے، میں اسے نہ ماروں؟ آپ نے فرمایا، اسے قتل نہ کرو، کیونکہ اگر تم نے اسے قتل کر دیا تو وہ ایمان کی حالت میں مرے گا جو اس نے قتل ہونے سے پہلے قبول کیا تھا، لیکن تم ویسے کافر ہو جاؤ گے جیسے وہ کلمہ پڑھنے سے پہلے تھا۔ (بخاری، رقم ۴۰۱۹، مسلم، رقم ۱۸۷) مقداد نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا''خوش بخت ہے جو فتنوں سے محفوظ کر دیا جائے، خوش بخت ہے جو فتنوں سے دور کر دیا جائے، سعادت مند ہے جو فتنوں میں پڑنے سے بچ جائے۔ جو ان میں مبتلا ہوا اور صبر کیا، اس کے کیا کہنے۔ (ابوداؤد، رقم ۴۲۶۳)

شیعہ سیدنا علی اور اہل بیت کے علاوہ صرف تین (دوسری روایت :کل سات، عمار بن یاسر، جابر بن عبداللہ انصاری اور بلال) صحابہ سلمان، مقداد اور ابوذر کو مخلصین میں شمار کرتے ہیں۔امام محمد باقر سے یہ روایت منسوب کی گئی ہے کہ (سیدنا علی کا آخر تک ساتھ دینے والے) عمار بھی (معاذ اللہ) دین سے پھر گئے تھے البتہ مقداد ارتداد سے بالکل پاک تھے۔یہی وجہ ہے کہ شیعہ مورخین مقداد کی مدح میں رطب اللسان ہیں۔'اختصاص' میں امام جعفر صادق کا قول نقل کیا گیا ہے، امت میں مقداد کا رتبہ وہی ہے جو قرآن مجید میں لفظ 'الف' کا ہے۔

مطالعۂ مزید: السیرۃ النبویہ (ابن ہشام)، الطبقات الکبریٰ (ابن سعد)، الجامع المسند الصحیح (بخاری، شرکۃ دار الارقم)، المسند الصحیح المختصر من السنن (مسلم، شرکۃ دار الارقم) الموسوعۃ الحدیثیۃ (مسند امام احمد بن حنبل)، تاریخ الامم والملوک (طبری)، معجم الصحابۃ (ابن قانع)، حلیۃ الاولیاء وطبقات الاصفیاء (ابونعیم اصفہانی)، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (ابن عبدالبر)، الکامل فی التاریخ (ابن اثیر)، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ (ابن اثیر)، تہذیب الکمال فی اسماء الرجال (مزی)، البدایۃ والنہایۃ (ابن کثیر)، تاریخ الاسلام (ذہبی)، سیر اعلام النبلاء (ذہبی)، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ (ابن حجر)، تہذیب التہذیب (ابن حجر)، Wikipedia

الطاف احمد اعظمی*

نظام سرمایہ داری اور اسلام

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

۔۔۔۔۔ ۲ ۔۔۔۔۔

مغربی ممالک کے مقابلے میں روس کے مزدوروں کی پست حالت کی اصل وجہ سرمائے کی غیر منصفانہ تقسیم تھی۔ اور یہی وہ بیماری ہے جس کو دور کرنے کے لیے مارکس نے اجتماعی ملکیت کا نظام پیش کیا تھا، لیکن روس ایک طویل مدت گزر جانے کے باوجود اس بیماری کا خاتمہ نہیں کر سکا۔ حقیقت یہ ہے کہ کمیونسٹ روس کا مزدور اسی طرح استحصال کا شکار تھا جس طرح وہ بورژوا سوسائٹی میں سرمایہ داروں کے استحصال کا عذاب جھیل چکا تھا۔

روس کے محنت کشوں کی جاں فشانی سے جو خطیر سرمایہ حاصل ہوتا تھا اس کے ایک بڑے حصے کو اصولاً مزدوروں کی فلاح و بہبود پر خرچ ہونا چاہیے تھا، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس سرمائے کا نصف حصہ قومی خزانے میں جو کمیونسٹ سماج کا بورژوا طبقہ تھا، جمع ہو جاتا تھا اور نصف حصے سے حکومت کے ارباب انتظام، افسروں، کارکنوں اور منیجروں کو بڑی بڑی تنخواہیں دی جاتی تھیں اور جو باقی بچ رہتا تھا اس سے مزدوروں کو اجرتیں دی جاتی تھیں اور سوشل انشورنس کے نام سے ان کی فلاح و بہبود پر خرچ کیا جاتا تھا۔

سرمایے کی اس تقسیم کو منصفانہ کون کہہ سکتا ہے۔ جو ہاتھ دولت پیدا کرے اس کو کم تنخواہ ملے اور جو لوگ محنت نہ کریں ان کو زیادہ تنخواہیں دی جائیں۔ کیا یہ بات خود مارکسزم کے اصولوں کے خلاف نہیں تھی؟ کوئی کہہ سکتا ہے کہ

---

* آر زیڈ ۱۰۹ بی، فلیٹ نمبر ۲۰۲، ۴ تغلق آباد ایکسٹنشن، نئی دہلی -۱۹۔

قومی سرمائے کا نصف حصہ قومی خزانے میں اس لیے جمع کر دیا جاتا تھا تاکہ اس رقم سے صنعت وحرفت اور تعلیم کو فروغ دیا جائے اور غیر ملکی سامراج کے خلاف قومی دفاع کو مضبوط بنایا جائے، لیکن یہ سب کام نظام سرمایہ داری میں بورژوا طبقہ بھی انجام دیتا تھا۔ پھر وہ مطعون کیوں تھا، کیا وہ فاضل سرمایے کو محض عیش وعشرت میں اڑا دیتا تھا؟ بورژوا طبقے کی قومی خدمات کو خود مارکس اور انگلس نے ان لفظوں میں سراہا ہے:

''بورژوا طبقہ وہ پہلا طبقہ ہے جس نے دکھا دیا ہے کہ انسان کی کارگزاری کیا کچھ کر سکتی ہے۔ اس نے وہ عجائبات پیش کیے ہیں جن کے مقابلے میں مصر کے اہرام، روم کی نہریں اور گاتھی نمونہ کے شاندار گرجے ہیچ ہیں۔ اس نے وہ مہمیں سر کی ہیں جن کے سامنے تمام اگلے زمانوں کی قوموں کی ہجرتیں اور صلیبی جنگیں مات ہیں۔''

(کمیونسٹ مینی فسٹو، ص ۶۰)

یہ عبارت بھی ملاحظہ ہو:

''بورژوا طبقہ نے بہ مشکل ایک سو برس کے دور میں حکومت میں اتنی بڑی اور دیوپیکر قوتیں تخلیق کی ہیں کہ پچھلی تمام نسلیں مل کر بھی نہ کر سکی تھیں۔ قدرت کی طاقتوں پر انسان کی کارفرمائی، مشینیں، صنعت اور زراعت میں کیمیا کا استعمال، دخانی جہاز رانی، ریلیں، تار برقی، کھیتی کے لیے پورے کے پورے براعظموں کی صفائی، دریاؤں سے نہر کاٹنا، گویا جادو کے زور سے زمین کا سینہ چیر کر چشم زدن میں بڑی بڑی آبادیوں کا ظہور میں آ جانا، آج سے پہلے کس زمانہ کے لوگوں کے ذہن میں آ سکتا تھا کہ اجتماعی محنت کی گود میں ایسی ایسی پیداواری طاقتیں پڑی سو رہی ہیں۔''

(کمیونسٹ مینی فسٹو، ص ۶۴)

بورژوا طبقہ پر مارکسزم کے ہم نواؤں کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ وہ مزدوروں کو ان کی محنت کا قلیل حصہ بطور اجرت دے کر باقی سرمائے کو یا مارکس کے الفاظ میں قدر زائد (Surplus Value) کو خود ہضم کر جاتا تھا اور یہ طرز عمل ان کے نزدیک مزدوروں کے استحصال کے مترادف تھا۔ بلاشبہ یہ ایک بدترین استحصال تھا، لیکن یہی استحصال تو کمیونسٹ معاشرے میں بھی جاری رہا۔ فرق صرف یہ ہوا کہ استحصال کرنے والا طبقہ اب بورژوا کے بجائے خود کمیونسٹ پارٹی بن گئی۔

سرمایہ داری (Capitalism) اور اجتماعی ملکیت کے نظاموں کی خرابیاں قارئین نے دیکھ لیں اور معلوم ہو گیا کہ ان نظاموں نے دنیائے انسانیت کو دکھ درد اور ظلم واستحصال کے سوا اور کچھ نہیں دیا ہے۔ آج دنیا اس بات کی شدت سے آرزومند ہے کہ کوئی ایسا نظام معیشت ہو جس میں مذکورہ دونوں نظاموں کی خرابیاں نہ ہوں۔ اور یہ اسلام کے نظام معیشت کے سوا کوئی دوسرا نظام نہیں ہو سکتا ہے۔ اگلے صفحات میں اس نظام کو اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے تاکہ دنیا اس سرچشمۂ خیر وبرکت کی طرف متوجہ ہو۔

اسلامی نظام معیشت

معاش کا انسان کی زندگی سے جو گہرا تعلق ہے وہ بالکل واضح ہے۔ قرآن میں اس کو قیام زندگی کا ایک مضبوط ذریعہ قرار دیا گیا ہے:

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا. (سورۂ نساء۴:۵)

''اپنے اموال جن کو اللہ نے تمھارے لیے گزر بسر کا ذریعہ بنایا ہے، کم عقلوں (یعنی بچوں) کے حوالے نہ کرو۔''

اسلام دنیا کا واحد مذہب ہے جس میں مال اور کسب مال کو اچھی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں مال کے لیے خیر (البقرہ۲:۲۱۵) اور فضل (البقرہ۲:۱۹۸) کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں اور اہل ایمان کو تعلیم دی گئی ہے کہ وہ کسب معاش میں سرگرمی دکھائیں۔ فرمایا ہے:

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ. (سورۂ جمعہ۶۲:۱۰)

''پس جب (جمعہ کی) نماز ہو چکے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل (یعنی روزی) تلاش کرو۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

كسب الحلال فريضة بعد الفريضة. (کنزالعمال)

''عبادت کے بعد حلال روزی حاصل کرنا فرض کے درجے میں ہے۔''

ایک دوسری روایت میں ہے:

قال النبی صلی اللّٰه عليه وسلم، ان قامت الساعة وفی احدكم فسيلة، فان استطاع ان لا تقوم حتی يغرسها فيغرسها. (کنزالعمال)

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اگر قیامت کی گھڑی آجائے اور تم میں سے کسی کے ہاتھ میں کھجور کا پودا ہو تو اگر اس کے بس میں ہو کہ کھڑا نہ ہو جب تک کہ اس کو بو لے تو چاہیے کہ اس پودے کو بو دے۔''

یہی وجہ ہے کہ اسلام میں سوال یعنی دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے منع کیا گیا ہے، کیوں کہ یہ عمل انسان کے مقام و مرتبہ سے فروتر ہے۔ روایت ہے کہ ایک غریب انصاری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور مدد چاہی۔ آپ نے فرمایا، تمھارے پاس کوئی چیز ہے؟ انھوں نے عرض کیا کہ میرے پاس صرف ایک ٹاٹ ہے، اس کے ایک حصہ کو بچھاتا ہوں اور دوسرے کو اوڑھتا ہوں۔ اس کے علاوہ ایک پیالہ ہے جس سے پانی پیتا ہوں۔ آپ نے فرمایا، جاؤ اور یہ سامان لے آؤ۔ وہ دونوں سامان لے کر آ گئے۔ آپ نے صحابہ کو جمع کیا اور فرمایا: 'من يشری

ھذین ''؟''کون ان دونوں چیزوں کو خرید تا ہے؟''ایک صحابی نے کہا:'انا اخذھما بدرھم '''میں ایک درہم میں ان کو لیتا ہوں۔'' آپ نے فرمایا:'من یزید درھم '''کون ایک درہم پر اضافہ کرتا ہے؟''ایک صحابی نے دو درہم میں خرید لیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دونوں درہم غریب انصاری کو دے کر فرمایا:''ایک درہم سے غلہ خرید کر گھر پہنچا دو اور ایک درہم سے کلہاڑی خرید کر لاؤ۔''

حضرت انس رضی اللہ عنہ جو اس روایت کے راوی ہیں، فرماتے ہیں کہ غریب انصاری نے ایسا ہی کیا اور ایک کلہاڑی خرید کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے۔ آپ نے اپنے ہاتھوں سے اس میں ایک لکڑی ٹھونکی اور اسے انصاری کو دیتے ہوئے فرمایا:'اذھب فاحتطب و بع و لا نرینّہ خمسۃ عشر یو ما '''جاؤ اور لکڑیاں کاٹ کر لاؤ اور بیچو اور میں تمھیں پندرہ دن تک نہ دیکھوں (یعنی پندرہ دن سے پہلے نہ ملو)۔'' چنانچہ وہ پندرہ دن کے بعد آئے اور کہا: یا رسول اللہ، میں نے اتنے دنوں میں دس درہم کمائے۔ چند درہموں سے کپڑے خریدے اور چند درہم سے کھانا (غلہ) لیا۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا:

ھذا خیر لك من ان تجیٔ و المسئلۃ نکتۃ فی وجھك یوم القیامۃ.

''یہ تمھارے لیے اس بات سے بہتر ہے کہ تم قیامت کے دن اس حال میں آؤ کہ سوال تمھارے چہرے میں داغ بنا ہوا ہو۔'' (ابوداؤد، ترمذی)

اسلامی نظام معیشت کے بنیادی اصول

اسلام کے نظام معیشت کا پہلا اصول کسب معاش میں جدوجہد ہے، جیسا کہ سورۂ جمعہ ۶۲ کی آیت ۱۰ سے بالکل واضح ہے اور اس کا ذکر ہو چکا ہے۔ اس اصول کے مطابق ضروری ہے کہ معاشرے کا ہر فرد جو کمانے پر قادر ہے، تلاش رزق کے عمل میں حتی الوسع شریک ہو۔ جو لوگ قدرت کے باوجود کسب معاش میں حصہ نہیں لیتے وہ درحقیقت سماج پر ایک بوجھ اور اس کے ناپسندیدہ افراد ہیں۔ چنانچہ ایسے لوگوں کی حاجت روائی سے منع کیا گیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

لا تحل الصدقۃ لغنی و لا الّذی مرۃ سوی. (صحاح[1])

''صدقہ غنی[2] کے لیے جائز ہے اور نہ اس آدمی کے لیے جو قوی اور تندرست ہو۔''

---

[1] ایک دوسری روایت میں 'القوی المکتب'' (قوی کمانے والے) کے الفاظ آئے ہیں۔

[2] غنی سے مراد وہ شخص ہے جو اپنے اور اپنے اہل وعیال کے روزمرہ مصارف کے علاوہ دو سو درہم، یا ساڑھے باون تولہ

اسلامی نظام معیشت کا دوسرا اصول ذریعے کی پاکیزگی ہے، یعنی مال جائز ذریعوں سے حاصل کیا جائے۔ فرمایا ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ. (البقرہ۲:۱۶۸)

''اے لوگو، زمین میں جو چیزیں حلال وطیب ہیں ان کو کھاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو، وہ تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے۔''

اس آیت میں حلال کے ساتھ طیب کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ علامہ رشید رضا مصری نے اس کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''قرآن میں جن چیزوں کو حرام کہا گیا ہے ان کی حرمت ذاتی ہے اور ان کو مضطر کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں استعمال کر سکتا ہے، لیکن کچھ چیزیں ایسی ہیں جن میں بذات خود حرمت نہیں پائی جاتی، بلکہ خارجی اسباب سے ان میں حرمت آجاتی ہے۔ طیب کے لفظ سے اسی قسم کی اشیاء کی حرمت کو واضح کیا گیا ہے۔ پس وہ تمام چیزیں جو ناجائز ذریعوں، مثلاً رشوت، قمار، غصب، دھوکا فریب، خیانت اور چوری وغیرہ سے حاصل کی گئی ہوں وہ بھی حرام ہیں۔ الغرض ہر خبیث شے خواہ اس میں خبث خارجی ذرائع سے آیا ہو اور خواہ اس کے اندر موجود ہو، حرام ہے۔''[۳]

انفرادی ملکیت کا نظام ہو یا اجتماعی ملکیت کا، دونوں میں نہ تو اموال کے حلال ہونے کی شرط ہے اور نہ ہی ذرائع مال کا جائز ہونا ضروری ہے، کیوں کہ ان مادی نظامات میں جائز اور ناجائز کا سرے سے کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ بس مال ہونا چاہیے، خواہ اس کا ذریعہ قمار بازی ہو یا شراب سازی۔ چنانچہ بہت سے ملکوں کی آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ قمار بازی (لاٹری) اور شراب کا کاروبار ہے۔

لیکن قارئین نے دیکھا کہ اسلام کے نظام معیشت میں مال کے حلال ہونے کے ساتھ ذریعۂ حصول کی طہارت بھی لازمی ہے۔ اس کی نظر میں ایک روپیہ اس ایک لاکھ روپے سے بدرجہا بہتر ہے جو حرام طریقے سے حاصل کیا گیا ہو۔ فرمایا ہے:

قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ. (المائدہ۵:۱۰۰)

''کہہ دو، ناپاک اور پاک برابر نہیں ہیں، اگرچہ ناپاک کی کثرت تم کو کتنی ہی عمدہ معلوم ہو، اے عقل مندو! اللہ کی نافرمانی سے بچو تاکہ تمھیں فلاح حاصل ہو۔''

اسلامی معیشت کا تیسرا اصول میانہ روی ہے، یعنی مال خرچ کرنے میں اعتدال کی روش اختیار کی جائے۔ یہ

چاندی، یا اس کے مساوی ملکیت رکھتا ہو۔

۳؎ تفسیر المنار، ج۱، ص۸۷، مزید دیکھیں، تفسیر ابن کثیر، ج۱، ص۲۰۳۔

اصول استحکام معیشت میں اساسی حیثیت رکھتا ہے۔ فرمایا ہے:

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا. (بنی اسرائیل ۱۷:۲۹)

''اور نہ تو اپنا ہاتھ گردن سے باندھ لو (یعنی بخل کرو) اور نہ ہی بالکل کھول دو، پھر ملامت زدہ اور تہی دست ہو کر بیٹھ رہو۔''

دوسری جگہ ہے:

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا. (سورۂ فرقان ۲۵:۶۷)

''اور وہ لوگ (یعنی اہل ایمان) جس وقت خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ ہی تنگی کرتے ہیں، ان کا انفاق اس کے (یعنی خرچ کی ان دونوں انتہائی حالتوں کے) درمیان اعتدال پر ہوتا ہے۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: 'الاقتصاد فی النفقة نصف المعیشة'[۴] ''خرچ میں میانہ روی معیشت کی خوش گواری کا نصف حصہ ہے۔'' آپ کا یہ ارشاد بھی ملاحظہ ہو:

''حضرت ابودرداء سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی شخص کی دانائی میں سے یہ بات بھی ہے کہ وہ اپنی معیشت میں اعتدال اختیار کرے۔'' (رواہ امام والطبرانی، مزید دیکھیں، التفسیر الکبیر، ۱۹/۴۲)

اس کے برخلاف خرچ میں افراط وتفریط سے معاشی زندگی میں خلل پڑتا ہے۔ تفریط یعنی بخل کا فساد تو بالکل واضح ہے کہ اس سے مال کی فیض بخشی مسدود ہو جاتی ہے۔ بخیل اپنے مال سے نہ خود فائدہ اٹھاتا ہے اور نہ ہی سماج کے حاجت مندوں کو اس سے کوئی فائدہ پہنچتا ہے۔ افراط یعنی اسراف وتبذیر کا نقصان یہ ہے کہ اس سے مال ضائع ہو جاتا ہے۔

اسراف کا مفہوم یہ ہے کہ مال جتنی مقدار میں خرچ ہونا چاہیے اس سے کہیں زیادہ خرچ ہو جائے، اور تبذیر یہ ہے کہ مال اس جگہ خرچ کیا جائے جو اس کے خرچ کا حقیقی محل نہ ہو۔ خود اس لفظ کا مادہ 'بذر' اس کے مفہوم کو واضح کر دیتا ہے۔ 'بذر' کے معنی تخم کے اور 'تبذیر' کے معنی تخم چھڑکنے کے ہیں۔ جس طرح کسان اپنے کھیت میں تخم ریزی کرتا ہے اور اس خیال کے بغیر دانے پھینکتا جاتا ہے کہ وہ کہاں گریں گے اور کہاں نہیں گریں گے، اسی طرح دولت مند اپنی دولت بے دریغ خرچ کرتا ہے اور اس کی پروا نہیں کرتا کہ یہ جائز خواہشات کی تکمیل میں خرچ ہو رہی ہے یا ناجائز کاموں میں۔ شیطان کے ایک معنی قوت کا غلط راہ میں استعمال بھی ہے۔ اسی لیے قرآن میں 'مبذر' کو شیطان کا بھائی

۴؎ کنز العمال، عن ابن عمر۔

کہا گیا ہے 'اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ' (بنی اسرائیل ۱۷:۲۷)

روایات و آثار سے بھی 'تبذیر' کے مفہوم کی وضاحت ہوتی ہے۔ حضرت عبد اللہ ابن مسعود اور عبد اللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ حق کے خلاف ہر قسم کے خرچ کو 'تبذیر' کہتے ہیں۔ مجاہد کا قول ہے کہ اگر کوئی شخص حق کی راہ میں اپنا سارا مال خرچ کر ڈالتا ہے تو یہ اسراف نہیں کہا جائے گا لیکن اگر اس نے تھوڑا مال بھی ناحق کی راہ میں خرچ کر دیا تو یہ 'تبذیر' ہے[۵]۔

حضرت انس بن مالک روایت کرتے ہیں کہ قبیلہ بنی تمیم کے ایک آدمی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! میں ایک مال دار آدمی ہوں۔ اپنے اہل وعیال پر خرچ کے علاوہ مہمان نوازی بھی کرتا ہوں۔ آپ مجھے بتائیں کہ میں اپنا مال کس طرح خرچ کروں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، پہلے اپنے مال کی زکوٰۃ نکالو اگر وہ زکوٰۃ کی مقدار کو پہنچتا ہو، اس لیے کہ زکوٰۃ مال کو خباثت سے پاک کرتی ہے۔ اس کے بعد صلۂ رحمی کرو، اور سائل، اجنبی اور مسکین کے حقوق بھی ادا کرو (یعنی ان کی حاجت روائی کرو)۔ اس نے کہا، اے اللہ کے رسول، اس بات کو چند مختصر الفاظ میں فرما دیجیے۔ آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: 'وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا' اس نے کہا، بس یہ میرے لیے کافی ہے[۶]۔

معلوم ہوا کہ حق داروں کا حق ادا کرنے کے بجائے مال کو غلط کاموں، مثلاً قمار بازی، شراب نوشی، شاہد بازی وغیرہ میں اڑا دینا 'تبذیر' ہے[۷]۔

اسلامی معیشت کا چوتھا اصول عدم احتکار (Deconcentration of wealth) ہے یعنی ایک جگہ زیادہ مال جمع نہ ہو۔ جب صحابہ نے پوچھا کہ کتنا خرچ کیا جائے 'يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ' تو جواب دیا گیا، جو زائد ہو 'قُلِ الْعَفْوَ' (البقرہ ۲:۲۱۹)۔

لغت میں 'عفو' کا مطلب زیادتی اور بڑھوتری ہے۔ معروف امام لغت فراء سے یہی معنی منقول ہیں۔ اس کے الفاظ ہیں: 'قوله تعالٰی، العفو وهو فضل المال' "اللہ تعالیٰ کے ارشاد 'قُلِ الْعَفْوَ' سے مراد مال کا فضل

---

۵ تفسیر ابن کثیر ۶/۶۳۔

۶ تفسیر ابن کثیر ۶/۶۳۔

۷ تفسیر ابن کثیر ۶/۶۳۔
امام ریاست کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ایسے 'مبذرین' کا مال ان سے بالجبر حاصل کر کے سماج کے غربا و مساکین پر خرچ کرے۔ دیکھیں، المحلیٰ، علامہ ابن حزم ۶/۱۵۶۔

یعنی بڑھوتری ہے۔[8]

اس معنی کے لحاظ سے مذکورہ آیت میں 'عفو' کا مطلب یہ ہوگا کہ جو مال ضرورت سے زائد ہو اس کو حاجت مندوں پر خرچ کیا جائے۔ ایک روایت سے اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔ حضرت ابوسعید خدری کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جس شخص کے پاس طاقت وقوت کا کوئی سامان اپنی ضرورت سے زائد ہو وہ اس فاضل سامان کو کم زور کو دے دے، اور جس شخص کے پاس کھانے پینے کا سامان حاجت سے زائد ہو وہ یہ فاضل سامان ضرورت مند کو دے دے۔ ابوسعید خدری کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح مختلف قسم کے اموال کا ذکر فرماتے رہے، یہاں تک کہ ہم نے یہ خیال کیا کہ ہم میں سے کسی شخص کو اپنے فاضل سامان پر کوئی حق نہیں ہے۔''

(المحلیٰ، علامہ ابن حزم ظاہری ۶/۱۵۷-۱۵۸)

اس سلسلے میں بعض اصحاب رسول کا خیال تھا کہ ضرورت سے زائد مال رکھنا حرام ہے۔ مشہور صحابی حضرت ابوذر غفاری کا یہی مسلک تھا، لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اپنی اور اپنے بال بچوں کی حاجتوں کو پورا کرنے اور زکوٰۃ نکال دینے کے بعد بھی اگر مال بچ جائے تو اولیٰ یہی ہے کہ یہ فاضل مال حاجت مندوں کو دے دیا جائے۔[9]

معاشی نابرابری

سماج میں معاشی نابرابری کے پیدا ہونے کے متعدد اسباب ہیں۔ سب سے بڑا سبب افراد کے درمیان جسمانی اور عقلی صلاحیتوں کا فرق ہے۔ اسی فرق کی وجہ سے معاشی نابرابری اور پھر اس کے نتیجے میں متعدد سماجی مسائل پیدا ہوتے ہیں، جن کا ازالہ ایک ناگہانی سماجی ضرورت ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس کا ازالہ کس طرح ہو۔ اسلام نے اس کے لیے جو طریقے اختیار کیے ہیں وہ دوسرے معاشی نظاموں کے مقابلے میں زیادہ حقیقت پسندانہ ہیں۔ وہ اصولی حیثیت سے معاشی نابرابری کو سماج کی ایک اٹل

۸۔ دیکھیں، لسان العرب، تحت کلیہ 'عفو'۔

۹۔ یہ اولیٰ بات اس وقت مطلوب ہوگی جب صحیح معنی میں اسلامی ریاست قائم ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کو ناگہانی ضرورتیں بھی پیش آتی ہیں۔ اگر اسلامی ریاست نہیں ہے تو ان ضرورتوں کو کون پورا کرے گا؟ اس لیے موجودہ دور میں ہر صاحب مال سے بس اتنا ہی مطلوب ہے کہ وہ خدا کی راہ میں حتّی المقدور انفاق کرتا رہے، خواہ زکوٰۃ کی شکل میں اور خواہ صدقہ نکال کر۔

حقیقت کے طور پر تسلیم کرتا ہے، کیوں کہ یہ ایک فطری عمل ہے۔ فرمایا ہے:

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا. (سورۂ زخرف ۴۳: ۳۲)

''ہم نے اس دنیا کی زندگی میں لوگوں کی روزی ان کے درمیان تقسیم کر دی ہے، اور ایک کا درجہ دوسرے سے بلند رکھا ہے تا کہ وہ باہم ایک دوسرے سے کام لے سکیں۔''

اس آیت میں ایک کا درجہ دوسرے سے بلند کرنے کا مطلب ان کا سماجی درجہ بلند کرنا نہیں، بلکہ علم و ہنر میں ایک کو دوسرے پر فضیلت دینا مراد ہے۔ اللہ نے اس دنیا میں ہر شخص کو الگ الگ صلاحیت اور قوت کار دی ہے۔ اگر وہ ایک کام کے لیے موزوں ہے تو دوسرے کام کے لیے غیر موزوں۔ اس لیے وہ مجبور ہے کہ دوسرے سے مدد لے۔ اس طرح سب لوگ مل کر سماج کی مختلف النوع ضرورتیں پوری کرتے ہیں اور اس کی تعمیر و ترقی میں اپنا مفوضہ کردار ادا کرتے ہیں۔ اگر سب کو ایک ہی طرح کا علم و ہنر دے دیا گیا ہوتا تو انسان کی بہت سی سماجی ضرورتیں پوری نہیں ہو سکتی تھیں۔

جب صورت واقعہ یہ ہے کہ یعنی لوگوں میں جسمانی اور عقلی صلاحیتوں کا فرق فطری طور پر موجود ہے تو لازماً معاشی نابرابری پیدا ہوگی۔ اسلام اس معاشی فرق کو جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، تسلیم کرتا ہے، لیکن وہ اس معاشی نابرابری کو تسلیم نہیں کرتا جو ظلم و استیصال کے مختلف طریقوں کے استعمال سے پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ اس نے ایک طرف ظلم و استیصال کی راہ مسدود کی اور دوسری طرف حقیقی معاشی نابرابری کو اس کے فطری حدود میں قائم رکھنے کے لیے متعدد تدابیر اختیار کیں، جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ سب سے پہلے لوگوں کو اللہ کے قانون کسب سے آگاہ کیا گیا کہ ہر شخص روزی کمانے میں جدوجہد کرے تا کہ اللہ نے اس کے حصے میں جو روزی رکھی ہے وہ اس کو مل جائے:

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى. (سورۂ نجم ۵۳: ۳۹)

''اور یہ کہ انسان کے لیے وہی ہے جو اس نے کمایا۔''

اس کسب و سعی کے باوجود جو شخص بھی معاشی اعتبار سے دوسروں سے کم تر ہے وہ رنجیدہ نہ ہو اور نہ ہی اس کمی کو دور کرنے کے لیے کوئی ناجائز طریقہ اختیار کرے۔ اس کے لیے صحیح طریقہ یہ ہوگا کہ وہ سابقہ کوشش میں جو کمی رہ گئی ہے اس کو مزید کوشش سے دور کرنے کے لیے جائز اقدامات کرے اور ساتھ ہی اللہ سے کشادگی رزق کے لیے دعا بھی کرے۔ فرمایا ہے:

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ وَاسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمًا. (النساء۴:۳۲)

''اللہ نے جس چیز میں تم میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اس کی خواہش نہ کرو، مردوں کے لیے ان کی کمائی کے لحاظ سے حصہ ہے اور عورتوں کے لیے ان کی کمائی کے لحاظ سے حصہ ہے، اور اللہ سے ان کا فضل مانگو، بے شک اللہ ہر چیز کی خبر رکھتا ہے۔''

۲۔ حرام طریقوں سے مال حاصل کرنے کی سخت ممانعت کی گئی ہے۔ فرمایا ہے:

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ. (البقرہ۲:۱۸۸)

''اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقوں سے نہ کھاؤ اور اس کو حکام تک پہنچنے کا ذریعہ نہ بناؤ (یعنی ان کو رشوت نہ دو) تا کہ لوگوں کے مال کا ایک حصہ حق تلفی کر کے کھا جاؤ اور جانتے ہو (کہ تم حق تلفی کر رہے ہو)۔''

حرام طریقوں سے مال کھانے کی متعدد صورتیں ہیں جن کا ذکر حدیث و فقہ کی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ ہوا ہے۔ ان ہی باطل طریقوں میں ایک رشوت بھی ہے، جس کا اوپر کی آیت میں خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، یعنی حکام کو مال و متاع دے کر دوسروں کے اموال و املاک کو ہڑپ کر جانا۔ کسب مال کا ایک اور ناجائز طریقہ ذخیرہ اندوزی کر کے بازار میں مصنوعی قلت پیدا کرنا ہے، تا کہ چیزوں کے دام بڑھ جائیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

من دخل فی شئ من اسعار المسلمین لیغلیه علیهم، فان حقًا علی اللّٰه تعالٰی ان یقعده یعظم من النار یوم القیامة. (مسند احمد)

''جس نے چیزوں کے بھاؤ بڑھانے کے لیے مسلمانوں کے بازار میں دخل اندازی کی (یعنی اشیاے ضروریہ کو بازار میں آنے سے روک لیا) تو اللہ تعالیٰ پر واجب ہو جائے گا کہ وہ قیامت کے دن ایک بڑی (یعنی ہولناک) آگ کو اس کا ٹھکانا بنا دے۔''

۳۔ انسان کی فطرت میں خود غرضی موجود ہے، اس لیے وہ ہر کام میں اپنے ذاتی فائدے کو پیش نظر رکھتا ہے۔ اگر فائدے کی توقع ہو تو آگے بڑھتا ہے ورنہ رک جاتا ہے۔ انسان کی اس فطرت کا لحاظ کر کے صاحب ثروت اہل ایمان کو بکثرت اس بات کی تلقین کی گئی ہے کہ وہ انفاق کریں اور یہ نہ سوچیں کہ اس سے ان کے مال میں کمی ہوگی، وہ جو بھی خرچ کریں گے وہ ان کو واپس لوٹا دیا جائے گا۔ اور آخرت میں اس انفاق کے صلے میں ان کو امن و سکون کی زندگی

حاصل ہوگی۔ فرمایا ہے:

وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ. (البقرہ ۲: ۲۷۲)

''اور جو مال بھی تم خرچ کرو گے وہ تمھیں واپس مل جائے گا اور تمھاری ذرا بھی حق تلفی نہ ہوگی۔''

دوسری جگہ فرمایا ہے:

اَلَّذِيْنَ يُنفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ. (البقرہ ۲: ۲۷۴)

''جو لوگ اپنے مال شب و روز کھلے طور پر اور علانیہ بھی خرچ کرتے ہیں، ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے، ان کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ مغموم ہوں گے۔''

اسلام کے نظام معیشت میں معاشی نابرابری کو ایک مناسب حد کے اندر رکھنے کے لیے جو اقدامات کیے گئے ہیں وہ بہت مناسب اور انسانی فطرت کے مطابق ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس نظام میں اخلاقی تعلیمات کے ذریعے سے ایک ایسا ماحول بنایا جاتا ہے کہ سب لوگ اپنی مرضی اور خوشی سے ایک دوسرے کے غم گسار ہوتے ہیں اور ہر شخص خواہ امیر ہو یا غریب آگے بڑھ کر حسب حیثیت خدا کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتا ہے تاکہ مسلم سماج کے نادار لوگوں کی معاشی ضرورتیں پوری ہوں اور وہ خدا کے مزید لطف و کرم کے مستحق ٹھہریں۔

انفرادی ملکیت

اصولی طور پر اسلام انفرادی ملکیت کا حامی ہے، یعنی ہر شخص کو اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ وہ جائز ذرائع سے مال و جائداد حاصل کرے اور اس کو اس پر تصرف کا اختیار حاصل ہو، بشرطیکہ اسلامی ریاست کا مطالبہ پورا کر دیا جائے یعنی مال کی زکوٰۃ نکال دی جائے۔ انفرادی ملکیت کی حمایت کی وجہ یہ ہے کہ مال و جائداد کی محبت اور ان کے حصول کا جذبہ انسان کی فطرت میں موجود ہے۔ اس لیے انفرادی ملکیت کی ممانعت کا مطلب اس فطرت سے چشم پوشی ہوگی اور ایسا کر کے کوئی معاشی نظام کامیاب نہیں ہوسکتا ہے، جیسا کہ روس میں اجتماعی ملکیت کے نظام کی ناکامی سے ثابت ہو چکا ہے۔

انفرادی ملکیت کا تصور دراصل ذرائع پیداوار کی آزادی سے وابستہ ہے، یعنی ہر شخص کو یہ موقع اور آزادی حاصل ہو کہ وہ کسب مال کے لیے جس ذریعۂ معاش کو پسند کرتا ہے اس کو آزادانہ اختیار کرے اور اگر ایک سے زیادہ ذرائع پیداوار کو قانونی حد کے اندر اپنے زیر تصرف لانا چاہے تو اس میں کوئی رکاوٹ حائل نہ ہو۔

لیکن حصول ملکیت کی اس آزادی میں یہ خطرہ بہر حال موجود ہے کہ سماج کے چند لوگ اپنی کاروباری ذہانت اور مادی وسائل کی کثرت سے فائدہ اٹھا کر ذرائع پیداوار کے زیادہ حصے پر قابض ہو جائیں اور سماج کا ایک بڑا حصہ اس کے فوائد سے محروم ہو جائے۔

اس امکانی خطرے کے تدارک کی ایک صورت تو یہ ہے جیسا کہ اشتراکیت نے تجویز کیا ہے، کہ ذرائع معاش کو حکومت کی تحویل میں دے دیا جائے، دوسرے لفظوں میں اجتماعی ملکیت کا نظام نافذ کر دیا جائے۔ اس اقدام سے بلاشبہ بہت سے فوائد حاصل ہوں گے، لیکن اس میں نقصانات بھی ہیں۔ سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ انسانی فطرت کے بہت سے محاسن، مثلاً ایثار و سخاوت اور ہمدردی اور اخوت کے جذبات کو نشو و نما کا موقع نہیں ملے گا۔ اس کے علاوہ انسان کی فطرت میں خود غرضی کا جو مادہ ہے اور اس کے لیے سب سے بڑا محرک عمل ہے اور اسی پر بڑی حد تک انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تعمیر و ترقی منحصر ہے، وہ اس صورت میں دب کر رہ جائے گا۔ اس لیے ذرائع[10] پیداوار کو آزاد رکھنے میں ہی انسان اور اس کے معاشرے کی بھلائی ہے۔

انفرادی ملکیت کے نظام سے پیدا ہونے والے مذکورہ خطرے کے ازالے کی دوسری صورت یہ ہے کہ حق ملکیت کو باقی رکھتے ہوئے ایسی تدابیر کی جائیں جن سے ارتکاز مال و زر کا خطرہ دور ہو جائے اور انسان کی معاشی زندگی میں کوئی خلل بھی واقع نہ ہو۔ اسلامی نظام معیشت میں اس آخری صورت کو اختیار کیا گیا ہے۔

ام الفساد

کسی بھی نظام معیشت میں جو چیز ام الفساد ہے وہ ارتکاز مال ہے، یعنی چند افراد یا گروہوں کے پاس مال کی کثیر مقدار کا اکٹھا ہو جانا۔ نظام سرمایہ داری میں یہ خرابی اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ جاتی ہے اور اس سے معاشرے میں سخت معاشی ہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔ اس خرابی کو محض قانون بنا کر ختم نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اسلام نے اس خرابی کا جو علاج تجویز کیا ہے وہ نہایت کارگر ہے کیوں کہ وہ انسانی فطرت سے مطابقت رکھتا ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے اس بات کو واضح کیا گیا ہے کہ مال پر خواہ وہ کسی شکل میں ہو، جس طرح سماج کے خوش حال طبقہ کا حق ہے، اسی طرح غربا و مساکین کا بھی حق ہے 'حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ' (سورۂ ذاریات ۵۱:

---

[10] ذرائع پیداوار سے ہماری مراد زراعت، تجارت اور صنعت و حرفت ہیں۔ رہے قدرتی ذرائع، مثلاً معدنی کانیں، جنگل اور پہاڑ اور سمندر وغیرہ تو حکومت مفاد عامہ میں انھیں اپنے قبضہ میں لے سکتی ہے۔

۱۹) اس لیے اسلامی ریاست کے ارباب حل وعقد کا اخلاقی اور قانونی فریضہ ہے کہ وہ غربا و مساکین کے اس حق کا تحفظ کریں اور وہ تمام تدابیر عمل میں لائیں جن سے سماج میں ارتکاز زر کی صورت پیدا نہ ہو، یعنی چند افراد یا گروہوں کی مٹھی میں مال وزر کا بند ہو کر رہ جانا۔ فرمایا ہے:

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ كَىْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ. (سورۂ حشر ۵۹:۷)

’’اللہ جو مال بستی والوں سے لڑائی کے بغیر اپنے رسول کو دلا دے، اس میں اللہ کا، رسول کا، قرابت والوں کا، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کا حق ہے، تاکہ وہ تمھارے مال داروں ہی میں نہ گردش کرتا رہے۔‘‘

[باقی]

’’...ایسے لوگ جو ایمان کی روشنی ایک مرتبہ دیکھ لینے کے بعد، محض اپنے دنیوی مفادات کی خاطر اس سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں، اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے دلوں، ان کے کانوں اور ان کی آنکھوں پر مہر کر دیا کرتا ہے اور وہ ہدایت کی توفیق سے بالکل ہی محروم ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگ نہ خود اصل حقیقت پر غور کرتے، نہ کسی دوسرے معقول آدمی کی بات سنتے اور نہ بصیرت حاصل کرنے کے لیے اپنی آنکھیں کھولتے۔... یعنی اصل بے خبر یہی لوگ ہیں اس لیے کہ ان کے دل اور ان کے کان آنکھ سب جپاٹ ہو چکے ہیں۔ کسی طرف سے بھی کوئی بصیرت کی کرن ان کے اندر داخل ہونے کی کوئی گنجایش باقی نہیں رہی۔‘‘ (تدبر قرآن ۴/ ۴۵۴)

رضوان اللہ

میاں بیویوں کے سربراہ ہیں

قرآن مجید کی آیت ہے:

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ. (النساء۴:۳۴)

''(میاں اور بیوی کے تعلق میں بھی اِسی اصول کے مطابق) مرد عورتوں کے سربراہ بنائے گئے ہیں، اِس لیے کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت بخشی ہے اور اِس لیے کہ اُنھوں نے اپنے مال خرچ کیے ہیں۔ پھر جو نیک عورتیں ہیں، وہ (اپنے شوہروں کی) فرماں بردار ہوتی ہیں، رازوں کی حفاظت کرتی ہیں، اِس بنا پر کہ اللہ نے بھی رازوں کی حفاظت کی ہے۔'' (البیان ۱/۴۸۸)

اگر ترکیب کلام کی رعایت رہے اور زبان کی نزاکتیں بھی ملحوظ رکھی جائیں تو مذکورہ بالا ترجمہ، ہمارے نزدیک آیت کے مدعا کا صحیح ترین ابلاغ ہے، لیکن اشراق نومبر ۲۰۱۲ء کے شمارے میں شائع ہونے والے ایک مضمون نے جو پروفیسر خورشید عالم صاحب کی نگارشات پر مشتمل ہے، اس ترجمہ پر کچھ سوالات پیدا کر دیے ہیں۔ ان کا یہ مضمون اصل میں تو ایک عالم دین کے مقالے پر تنقیدی نظر سے لکھا گیا تھا اور وہی صاحب اس کا جواب دینے کا حق رکھتے تھے، لیکن اس میں قرآن مجید اور بالخصوص، مذکورہ آیت کی تفہیم سے متعلق چند مسائل اس طرح زیر بحث آ گئے ہیں کہ ہم جیسے طالب علموں کے لیے بھی اپنی گزارشات پیش کرنے کا ایک حد تک جواز پیدا ہو گیا ہے۔

اس آیت میں 'الرجال' کا ترجمہ مرد اور 'النساء' کا ترجمہ عورت کرنے پر پروفیسر صاحب کو کچھ تحفظات ہیں۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ مرد اور عورت کے الفاظ سے اس مقام پر پیچیدگیاں پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے، اس لیے انھیں چھوڑ کر یہاں میاں اور بیوی کے الفاظ استعمال کیے جائیں جو آیت کے شان نزول کے مطابق بھی ہوں گے

اور اس کے سیاق وسباق کے موافق بھی۔

اہل علم اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ بعض اوقات الفاظ تو عموم میں لکھے جاتے ہیں، مگر ان کا موقع استعمال ان میں ایک نوعیت کی تخصیص پیدا کر دیتا ہے۔ اور عام لفظ کا اس طرح تخصیص میں چلے جانے کا یہ اسلوب، کم وبیش ہر زبان میں مسلم قاعدے کی حیثیت رکھتا اور اہل زبان کی بول چال اور ان کی تحریر وتقریر میں عمومی طور پر شائع وذائع ہوتا ہے۔ بولنے والے اسے معمول میں بولتے اور لکھنے والے بے تکلف لکھتے ہیں اور ان کے مخاطبین بنا کسی الجھن میں پڑے اسے سمجھ لیتے ہیں۔ اردو زبان میں بھی جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ''مرد تو نان ونفقہ کا بار اٹھا کر بچوں سے بے پروا ہو جاتے ہیں اور اصل قربانی عورت دیتی ہے'' تو اس جملے میں مرد سے باپ مراد لینے اور عورت سے ماں مراد لینے میں کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح مذکورہ آیت میں بھی 'الرجال' اور 'النساء' کا ترجمہ جب مرد اور عورت کیا جاتا ہے تو اس کے بعد کی ہدایات بالکل واضح کر دیتی ہیں کہ اس سے مراد بہر حال، میاں اور بیوی ہی ہیں؛ اور یہ سب سمجھ لینے میں کسی ''پیچیدگی'' کے آ جانے کا ذرہ بھر امکان نہیں رہتا۔ لیکن بفرض محال، زبان کا یہ سادہ اسلوب اگر کسی کی گرفت میں نہ بھی آ سکے تو اس مسئلے کا حل بہر حال، یہ نہیں ہے کہ ہم زبان کی بے ساختگی اور اس کے حسن سے بے پروا ہو جائیں اور اس میں سہل ممتنع ٹانکنے لگیں، بلکہ اس کا حل یہ ہے کہ ہم زبان کو اس کی فطرت ہی پر رکھیں اور اس کے اسالیب کی صحیح پرکھ، زبان نا آشناؤں میں پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

نیز یہ بھی یاد رہے کہ اس طرح کے اسالیب برتنے میں محض زبان کے حسن ہی کا لحاظ نہیں ہوتا، بلکہ کچھ نہ کچھ معنویت بھی اس کا باعث ہوا کرتی ہے کہ جس کا ابلاغ متکلم کے پیش نظر ہوتا ہے۔ اس آیت میں جو لاریب، میاں بیوی کے تعلق سے آئی ہے، قرآن مجید اگر چاہتا تو 'الرجال' و 'النساء' کے بجاے وہ الفاظ بھی لا سکتا تھا جو زن وشو کے لیے عربی زبان میں عام مستعمل ہیں۔ مگر اس نے وہ مخصوص الفاظ چھوڑ کر جو عمومی الفاظ اپنائے ہیں، اس کی ایک معقول وجہ اگر اس آیت کے سیاق پر نظر ہو تو بآسانی سمجھ میں آ سکتی ہے۔

النساء کی اس آیت ۳۴ کی تمہید اصل میں آیت ۳۲ سے اٹھائی گئی ہے، یا دوسرے لفظوں میں آیت ۳۲ کی اصل ہے کہ جس پر یہ آیت متفرع ہوئی ہے۔ اس میں بیان ہوا ہے:

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ.	''اور جو کچھ اللہ نے تم میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دی ہے، اُس کی تمنا نہ کرو، (اِس لیے کہ) مردوں نے جو کچھ کمایا ہے، اُس کا حصہ انھیں مل جائے گا اور عورتوں نے جو کچھ کمایا ہے، اُس کا حصہ انھیں بھی

لازماً مل جائے گا۔‘‘

اس آیت میں جس فضیلت کی تمنا کرنے سے روکا گیا ہے وہ بلا اختلاف، مرد وعورت کی باہمی فضیلت ہے۔ مزید یہ کہ وہ اپنی حقیقت میں کسبی نہیں، بلکہ خلقی ہے۔ پہلی بات کی دلیل آیت میں مرد اور عورت کے الفاظ کا موجود ہونا ہے۔ دوسری بات کی دلیل خلقی کی تمنا چھوڑ کر کسبی کے حصول کی ترغیب دینا ہے۔ گویا یہ بات تمہید ہی میں واضح ہوگئی کہ مرد وزن کو ایک دوسرے پر کچھ نہ کچھ خلقی فضیلت ضرور حاصل ہے۔ اس کے بعد جب زن وشو کے معاملے میں ہدایات دینے کا موقع آیا کہ جس میں ایک فریق کو اس کی خلقی فضیلت ہی کی بنیاد پر قوامیت دی جانی ہے تو ظاہر ہے، یہاں میاں اور بیوی کے نہیں، مرد اور عورت کے الفاظ ہی موزوں ہو سکتے تھے جو تخصیص میں جا کر میاں اور بیوی کے رشتے کو بیان کرتے اور عموم میں رہتے ہوئے مرد کی وجۂ ترجیح کی طرف ایک ہلکا سا اشارہ بھی کر دیتے۔

اس کے بعد پروفیسر صاحب نے لفظ ’قوّام‘ کی تحقیق اور اس کے معنی کی تعیین پر تفصیل سے لکھا ہے۔ وہ بیان فرماتے ہیں کہ ’قام‘ جب عورت کے حوالے سے اور ’علی‘ کے صلے کے ساتھ آئے تو اہل لغت کے مطابق اس کا معنی شوہر کا بیوی کو روزی مہیا کرنا ہوتا ہے، اس لیے ’الرجال قوامون علی النساء‘ کا مطلب ان کے نزدیک یہ ہے کہ شوہر بیویوں کی روزی کا بندوبست کرنے والے، یعنی ان کے مالی کفیل ہیں۔

ان کی اس بات سے ہمیں اتفاق ہے کہ ’قام‘ جب عورت کے حوالے سے اور ’علی‘ کے صلے کے ساتھ آئے تو اس کا ایک معنی عورت کو روزی مہیا کرنا بھی ہوتا ہے، مگر اس سے یہ نتیجہ اخذ کر لینا کہ یہ اسی ایک معنی کے لیے آتا ہے، اس بات سے ہمیں اتفاق نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل لغت اس ترکیب کا مفہوم بیان کرتے ہوئے ’مانہا‘ ہی کہہ دینے پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ اس کے ساتھ ’وقام بشانہا‘ کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ جس کا معنی مالی کفالت سے آگے بڑھ کر عورت کے جملہ امور کا ذمہ دار ہو جانا ہے۔ اب زبان کے اس قاعدے سے تو سبھی واقف ہیں کہ جب لغت میں کسی لفظ کے ایک سے زیادہ معانی موجود ہوں تو ان میں سے کسی ایک کو ترجیح دینے کی واحد صورت، اس لفظ کا موقع استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ ’الرجال قوامون علی النساء‘ کے بعد بھی جب یہ جملہ آجاتا ہے کہ وہ مرد اپنے اموال میں سے خرچ کرتے ہیں تو یہ بات حتمی ہو جاتی ہے کہ اس سیاق میں ’قوام علی‘ کا معنی بہرحال، مال خرچ کرنا نہیں ہے۔ اس معنی کی نفی ہو جائے تو یہاں دوسرا معنی یعنی منتظم مراد لینے کا کم سے کم احتمال ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔ اور یہ احتمال اس وقت بالکل ہی قطعی[1] ہو جاتا ہے جب ’’نیک عورتیں شوہروں کی اطاعت گزار ہوتی ہیں‘‘ کے

---

[1] اور یہ معنی کیا اس وقت بھی قطعی نہیں ہوگا جب عورت کے نشوز کی صورت میں مرد کو اسے سزا دینے کا حق بھی اسی سیاق میں بلکہ متصل بعد ہی بیان کر دیا جائے گا۔

الفاظ 'قوّام علی' میں پائے جانے والے منتظم کے معنی کی طرف انگلی اٹھا کر اشارہ کر دیتے ہیں۔ نیز، معاملات کا اس طرح ذمہ دار اور منتظم ہو جانا، اپنے اندر ایک طرح کا اِستعلا بھی رکھتا ہے، اس لیے محتاط مترجمین نے 'قوّامون علی' کا مطلب ایسے الفاظ سے ادا کرنے کی کوشش کی ہے کہ جن کے ذریعے اس استعلا کو بھی کسی حد تک نمایاں کیا جا سکے۔

'قوام علی' کی اس تحقیق کے ہوتے ہوئے اب یہ کہنا کچھ حیثیت نہیں رکھتا کہ ''مالی کفالت کے معنوں کی تائید 'وبما انفقوا من اموالھم' کے جملے سے بھی ہوتی ہے''۔ کیونکہ ایسا کہنا لغت اور سیاق سے کھلا ہوا اِعراض تو ہے ہی، جس طریقے سے اس پر دلیل لائی گئی ہے وہ عمل بھی کچھ ایسا وقیع نہیں کہ لفظ کا معنی متعین کرنے کے لیے اس پر اعتماد کیا جا سکے۔ کیونکہ 'بما انفقوا' کی 'ب' تو اصل میں یہ بتاتی ہے کہ یہ جملہ ابتدائی جملے کی وجہ بیان کرنے کے لیے آیا ہے، نہ کہ اُس کی نوعیت واضح کرنے کے لیے۔ یعنی قوامیت مرد ہی کو کیوں دی گئی ہے 'بما انفقوا' لا کر اس سوال کا جواب دیا گیا ہے، نہ کہ اس کے ذریعے سے قوامیت کا مفہوم متعین کیا گیا ہے۔ اس بات کو سمجھ لینے کے بعد اگر ترجمہ کیا جائے تو مسبّب اور سبب کا باہمی رشتہ بالکل واضح ہو جاتا اور معلوم ہو جاتا ہے کہ شوہر کو قوامیت دینے کی وجہ یہ ہے کہ یہ مالی ذمہ داریوں کا بار اٹھائے گا۔ لیکن پروفیسر صاحب کی تاویل میں مسبّب اور سبب کے ساتھ جو کچھ ہوتا ہے اس سے قطع نظر، دیکھیے مدعا کی صورت کیا سے کیا ہو جاتی ہے: ''شوہر کو ذمہ دار ٹھیرایا گیا ہے کہ وہ اپنی بیوی کے اوپر خرچ کرے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس پر خرچ کرتا ہے۔'' گویا یہ آیت ذمہ داری اور اس کی وجہ کا بیان نہ ہوئی، کسی سزا کا بیان ہو گئی جو مرد بے چارے کو اپنی ذمہ داری ادا کرنے ہی پر سنا دی گئی ہے۔

بہر کیف، اگر یہ طے ہو جائے کہ 'قوامون علی النساء' مالی کفالت کا بیان نہیں، بلکہ شوہروں کو بیویوں کے اوپر حاصل ایک طرح کی بالادستی کا بیان ہے تو اس کے بعد اس مفہوم کو ترجمے کا جامہ پہنانے میں ہر کوئی دوسرے سے اختلاف کر سکتا ہے، اور اس اختلاف کی بنیاد یہاں سے بھی اٹھ سکتا ہے کہ ایسے الفاظ جو موجودہ دور میں توحّش یا تنفّر کا باعث بنتے ہوں، ان سے پرہیز کرنا از حد ضروری ہوتا ہے۔ ہمارے خیال میں بھی حاکم، مسیطر اور متسلط کے الفاظ کا معاملہ یہی ہے کہ انھیں سنتے ہی ذہن میں ایسا تاثر پیدا ہوتا ہے جو آج کی دنیا میں کسی کے لیے بھی قابل قبول نہیں ہے۔ لہٰذا ہم بھی سمجھتے ہیں کہ اس طرح کے الفاظ کو چھوڑ دینے میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہیے کہ یہ محض مترجمین اور مفسرین کے اپنائے ہوئے الفاظ ہیں، لیکن انھیں چھوڑ کر جن الفاظ کا چناؤ کیا جائے وہ بہرصورت، قرآن مجید کے مدعا کا بیان ہونے چاہییں نہ کہ مرعوبیت کی نفسیات اور خودساختہ نظریات کا عکس۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو شروع میں نقل کیے گئے ترجمہ میں ''سربراہ'' کا لفظ بڑا ہی معنی خیز ہے۔ فاضل

مترجم کا یہ انتخاب جس طرح قرآن مجید کے مفہوم کوادا کرنے کی اچھی کوشش ہے،اسی طرح حاکم ومتسلط جیسے الفاظ سے پیدا ہونے والے توحش اور پھر اسی بنیاد پر مسلم فکر پر ہونے والے اعتراضات کا بھی ایک اچھا جواب ہے۔

اس کے بعد پروفیسر صاحب نے آیت کے اگلے حصے 'بما فضل اللّٰہ بعضھم علی بعض' کے ذیل میں کچھ وضاحت فرمائی ہے۔ان کی بیان کردہ وضاحت میں سے اس بات کے تو ہم بھی مؤید ہیں کہ یہ الفاظ مرد کی مطلق فضیلت کا بیان نہیں ہیں،لیکن ان کا یہ فرمانا کہ یہ فضیلت مالی کفالت کی وجہ سے پیدا ہوگئی ہے،اس بات کے ہم قائل نہیں ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر یہی کہنا مقصود ہوتا تو اصل عبارت یوں ہوتی:'فضل اللّٰہ بعضھم علی بعض بما انفقوا من اموالھم'۔لیکن دیکھ لیجیے،یہ عبارت 'بما' سے شروع ہوئی ہے اور اس کے دونوں حصے ایک واؤ کے ذریعے سے ملے ہوئے ہیں۔یعنی اس میں 'و بما انفقوا من اموالھم' کے الفاظ 'بما فضل اللّٰہ بعضھم علی بعض' پر عطف ہو کر اور حرف جر کے اعادے سے آئے ہیں جو اس چیز کی بین دلیل ہیں کہ یہ دونوں فقرے آپس میں مسبب اور سبب کا رشتہ نہیں رکھتے، بلکہ یہ دونوں مل کر پہلے جملے کا سبب ہوتے ہیں۔آسان تر الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس آیت میں یہ بیان نہیں ہوا کہ مرد چونکہ خرچ کرتے ہیں،اس لیے صاحب فضیلت ہو جاتے ہیں، بلکہ یہ بیان ہوا ہے کہ ان کی خلقی فضیلت اور ان کا خرچ کرنا، یہ دو وجوہ ہیں کہ جن کی بنیاد پر یہ قوّام ہو جاتے ہیں۔

''اس لیے کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت بخشی ہے'' یہ الفاظ اس معاملے میں تو واضح ہیں کہ یہ مرد کی کلی فضیلت کا اظہار نہیں ہیں، کیا یہ شوہر کی جزئی فضیلت کو بیان کرتے ہیں،اس بات کو سمجھنے میں اکثر اوقات تسامح ہو جاتا ہے۔لہٰذا ہم آیت کے اس جز کو کسی سوال کے جواب میں بیان کرنے کے بجائے ایجابی انداز میں بھی بیان کیے دیتے ہیں۔

زیر بحث آیت میں فضیلت کے بیان کی تین ممکنہ صورتیں ہو سکتی تھیں۔پہلی یہ کہ اللہ نے عورت کو مرد پر فضیلت دی ہے، دوسری یہ کہ اللہ نے مرد کو عورت پر فضیلت دی ہے،اور تیسری یہ کہ اللہ نے دونوں کو ایک دوسرے پر فضیلت دے رکھی ہے۔ان میں سے پہلی صورت کا یہاں آ جانا تو ہرگز روا نہیں ہے، کیونکہ جب مرد کو سربراہ بنا دیا گیا تو اس کی دلیل میں یہ کہنے کا کوئی موقع نہیں رہا کہ عورت مرد پر برتری رکھتی ہے۔رہی دوسری صورت،تو وہ قیاس کے عین مطابق ہے کہ جب مرد کی سربراہی کا اعلان ہو تو اس کی دلیل میں مرد کی جزوی فضیلت کا بیان آئے تا کہ اس کے سربراہ ہونے کی وجہ بالکل واضح ہو جائے۔لازمی بات ہے کہ قرآن مجید اسی صورت کو اختیار کرتا اگر اس میں پائی جانے والی حکمت آسمانوں پر بننے کے بجائے زمین پر اور پھر منطق کے اصولوں پر بنی ہوتی۔لیکن اس نے اس قیاسی

اسلوب کو بھی چھوڑا اور 'بعضھم علی بعض' کی تیسری صورت کو اختیار کر لیا ہے۔ اب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ اُسے چھوڑنے اور اِسے اختیار کرنے کی آخر وجہ کیا ہے؟ ہمارے خیال میں اس احتراز و انتخاب کی وجہ یہ ہے:

آیت میں 'الرجال قوامون علی النساء' کا جملہ شوہر کے لیے بیوی پر ایک طرح کی بالادستی کا اظہار ہے، اس سے یہ گمان کیا جا سکتا تھا کہ شوہر کو حاصل ہونے والی یہ قوامیت شاید اس کی کسی مطلق فضیلت کی بنا پر ہے۔ اس کے بعد اگر یہ بھی کہہ دیا جاتا کہ یہ بالادستی اس وجہ سے ہے کہ ہم نے اس کو عورت پر فضیلت بخش رکھی ہے تو یہ جملہ اس کی مطلق فضیلت پر مہر تصدیق ثبت کر دیتا، حالاں کہ ایسی فضیلت مرد کو حاصل نہیں ہے۔ چنانچہ یہاں کوئی ایسا جملہ ہی موزوں ہو سکتا تھا جو ممکنہ غلط فہمی[۲] کا ازالہ کرتا اور یہ بھی بیان کر دیتا کہ خاندان کے دائرے میں جو فضیلت مرد کو حاصل ہو گئی ہے اس کی گنجایش اسی اصول پر پیدا ہوئی ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے پر کچھ نہ کچھ فضیلت ضرور رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے، یہ بات 'بعضھم علی بعض' کے عمومی اسلوب کو چھوڑ کر کسی اور طرح سے کہہ دینا ممکن ہی نہیں ہے۔

آیت میں 'فالصالحات قانتات' کے الفاظ بیوی کو واضح طور پر ترغیب دیتے ہیں کہ وہ شوہر کی فرماں بردار بن کر رہے کہ یہ اس کے سربراہ ہونے کا لازمی تقاضا ہے، لیکن شوہر کے اس حق اطاعت کو مان لیا جائے تو ہمارے ممدوح کا سارا استدلال اپنی بنیاد ہی کھو دیتا ہے، اس لیے انھوں نے اس پر بھی خاصی تفصیل سے بحث فرمائی ہے۔ انھیں پہلے تو اس بات پر اصرار رہا ہے کہ ''قنت' کا لفظ صرف اور صرف دین کے بارے میں اطاعت اور نیکی پر دلالت کرتا ہے''۔ پھر اس کی تائید میں شرعی دلیل انھوں نے کچھ یوں بیان فرمائی ہے: ''اس لیے قرآن کریم میں یہ لفظ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے لیے خاص ہے۔'' اور آخر کار یہ فیصلہ بھی فرما دیا ہے ''کسی شخص کی اطاعت کے لیے اس کا استعمال جائز نہیں [ہے]۔''

ہم طالب علم جس عربی زبان کی شد بد ہونے کا گمان رکھتے ہیں، اس میں تو 'قنت' کے لفظ کو ہرگز کوئی اعتراض نہیں ہے کہ اسے دینی معاملات میں استعمال کیا جائے یا پھر دنیوی امور میں۔ یہ بے چارا خدا کے سامنے بچھ جانے

۲۔ ممکنہ شبہات کو رفع کرنے کا یہ انداز، قرآن مجید کا عام طریقہ ہے۔ اس کی مثال میں وہ آیت بھی دیکھ لی جا سکتی ہے جو میاں بیوی کے حوالے ہی سے آئی ہے۔ سورۂ بقرہ ۲۲۸ میں ارشاد ہوتا ہے: 'وللرجال علیھن درجة' کہ مردوں کے لیے ان پر ایک درجہ ترجیح کا ہے۔ یہ ترجمہ 'درجة' کی تنوین کو تنکیر کی تنوین سمجھ کر کیا گیا ہے۔ ہو سکتا تھا کوئی دوسرا اِسی کو تفخیم کی تنوین مان کر اس کا ترجمہ 'بہت بڑا درجہ' کرتا اور اس طرح مرد صاحب کو جا عرش پر بٹھاتا۔ لیکن قرآن مجید نے اس متوقع احتمال کو 'ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف' کہہ کر یک سر مسترد کر دیا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اس آیت اور زیر بحث آیت میں فرق بس یہی ہے کہ یہاں ممکنہ شبے کا رد پہلے ہی سے کر دیا گیا ہے اور وہاں یہی عمل بعد میں ادا کیا گیا ہے۔

میں جس طرح فخر محسوس کرتا ہے، اسی طرح شوہر کی بھی کچھ نہ کچھ مان لینے میں اسے ''عار'' نہیں ہے۔ جیسے 'قنت للّٰہ' اہل زبان کا محاورہ ہے ایسے ہی 'قنت المراۃ لزوجھا' بھی انھی کا محاورہ ہے۔ اور پھر 'امراۃ قنوت' کی اصطلاح جو ہوسکتا ہے 'رجال قنوت' کی نازک طبیعتوں پر بہت ہی گراں بار ہو، بہرحال، اہل عرب کی وضع کی ہوئی اصطلاح ہی ہے، نہ کہ پنجاب کے کسی زورآور مجازی خدا کی۔

اسی طرح ان کی یہ بات بھی کہ لفظ 'قنوت' قرآن مجید میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے ساتھ خاص ہے، ہمارے لیے کچھ قابل فہم نہیں ہے۔ اس لیے کہ لفظ کا اس طرح خاص ہوجانا، خود زبان کی شہادت کی بنیاد پر ہوگا یا پھر کسی شرعی دلیل کی بنیاد پر۔ زبان میں اس لفظ کے خاص ہوجانے کی نہیں، الٹا اس کے عام ہونے کی شہادت پائی جاتی ہے، جیسا کہ ہم بیان کرچکے ہیں۔ اسی طرح شرعی مصادر میں بھی ایسی کوئی دلیل نہیں پائی جاتی جو یہ بتاتی ہو کہ اللہ اور رسول نے اس لفظ کو اپنی اطاعت کے لیے خاص کر رکھا ہے۔

دراصل، آیت کے اس جزو میں اصل مسئلہ 'قانتات' کے متعلق کی تعیین کا ہے کہ وہ 'الرجال' ہے، یا پھر لفظ 'اللّٰہ'۔ کیونکہ 'قانتات' کو 'الرجال' سے متعلق کریں گے تو معنی ہوگا کہ نیک بیویاں وہ ہیں جو اپنے شوہروں کی اطاعت گزار ہیں، اور اگر اسے لفظ 'اللّٰہ' سے متعلق کردیں گے تو مطلب ہوجائے گا کہ وہ بیویاں اللہ کی اطاعت گزار ہیں۔ سیاق کلام میں مفعول کی اس تعیین کے جو ممکنہ وجوہ ہوسکتے ہیں، ان کا ذکر ہم ذیل میں کیے دیتے ہیں:

اول، بڑی سادہ سی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شوہر کو سربراہ بنایا تو پہلے اس تقرر کے دلائل دے دیے اور پھر اُس کی سربراہی کا لازمی تقاضا، یعنی بیوی کی اطاعت گزاری کا بیان کردیا اور بس۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو درمیان میں آجانے والے جملے معترضہ قرار پاتے اور 'قانتات' اور 'حافظات' کے الفاظ براہ راست 'الرجال' سے متعلق ہوجاتے ہیں۔

دوم، 'فالصالحات قانتات' کے ساتھ ایک 'ف' بھی آگئی ہے جو بہرحال، زائد نہیں ہے۔ اگر اس کا حق صحیح طور پر ادا کیا جائے تو یہ الفاظ اصل میں ان عورتوں کے صالح ہونے کا بیان ہیں جو اپنے شوہروں کی سربراہی کا لازمی تقاضا مان لیتی ہیں۔ یعنی ان میں یہ بیان ہوا ہے کہ شوہر چونکہ سربراہ ہیں اور بیویوں پر اس وجہ سے ان کی اطاعت لازم ہے، چنانچہ نیک بیویاں وہی ہیں جو ان کی اطاعت گزار ہیں۔ سو اس طرح بھی واضح ہوجاتا ہے کہ یہاں 'الرجال' کا لفظ ہی 'قانتات' کا مفعول ہے۔

سوم، آیت کے اسی حصے میں 'حافظات للغیب' کے الفاظ بھی قابل غور ہیں۔ ان کا مفہوم کوئی بھی یہ نہیں بیان

کرتا کہ وہ عورتیں اللہ کے رازوں کی حفاظت کرتی ہیں، بلکہ سب کے نزدیک اس کا مفہوم یہی ہے کہ وہ شوہروں کے رازوں کی حفاظت کرتی ہیں، اور ایک دوسری تاویل کے مطابق، وہ شوہروں کی غیر موجودگی میں حفاظت کرتی ہیں۔ یعنی ہر دو صورت میں اس کا متعلق 'الرجال' ہی قرار پاتا ہے۔ اب یہ بھی طے ہے کہ 'حافظات' کا یہ لفظ 'فالصالحات' کی دوسری خبر ہے اور اس طرح 'قانتات' میں، جو کہ پہلی خبر ہے، اور اس میں ایک واضح مناسبت بھی ہے۔ ان دونوں چیزوں کے ہوتے ہوئے جب ہم 'قانتات' کا مفعول طے کریں گے تو وہ بھی ظاہر ہے، وہی ہوگا جو 'حافظات' کا ہے۔ تالیف یہ ہوگی: 'قانتات للرجال و حافظات لغيبهم'۔

چہارم، ہماری علمی تربیت کے لیے قرآن مجید نے بہت سے مقامات پر یہ طریقہ بھی اختیار کیا ہے کہ وہ ایک مشفق استاد کی طرح پہلے تو کچھ چیزوں کو اجمال میں ذکر کرتا، پھر ان کی طرف کچھ اشارے کرتا چلا جاتا اور آخر کار انھیں بالکل کھول کر بیان کر دیتا ہے۔ یہاں بھی یہی کچھ ہوا ہے۔ اس نے پہلے تو 'قانتات' کے مفعول کو حذف کیا ہے، پھر 'حافظات للغيب' میں اس کی طرف کچھ اشارہ کر دیا ہے، اور اس کے بعد 'فان اطعنکم' کے الفاظ میں 'اطعن' سے 'قانتات' کا معنی اور 'کم' کی ضمیر مخاطب سے اس کے مفعول کو بالکل ہی واضح کر دیا ہے کہ یہ کوئی اور نہیں، بلکہ 'الرجال' ہی ہے۔

مزید یہ کہ قرآن مجید کے مدنظر بھی اگر یہی بیان کرنا ہوتا کہ بیویاں اللہ کی فرماں بردار ہیں، جیسا کہ ہمارے ممدوح کی رائے ہے، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ 'قانتات' کے لفظ کو 'فالصالحات' کی خبر بنا کر کیوں لاتا؟ پھر تو 'فالصالحات القانتات حافظات' کا اسلوب زیادہ موزوں ہوتا۔ یعنی ''جو نیک عورتیں ہیں، وہ فرماں بردار ہوتی ہیں، رازوں کی حفاظت کرتی ہیں''، اس کے بجائے یہ کہا جاتا کہ جو نیک فرماں بردار عورتیں ہوتی ہیں، وہ رازوں کی حفاظت کرتی ہیں۔

پروفیسر صاحب نے اپنی رائے کو مؤکد کرنے کے لیے لغوی اور شرعی دلائل ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ کچھ معنوی دلائل بھی فراہم کیے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ میاں اور بیوی کے باہمی تعلقات ایک ساتھی اور شریک حیات کے ہوتے ہیں نہ کہ حاکم اور محکوم کے۔ اس کی وجہ بیان کرتے ہیں کہ حاکم و محکوم کے تعلق میں محبت، سکون اور اطمینان کی فضا کبھی قائم ہی نہیں ہو سکتی، ہاں، رفاقت، مشورہ اور باہمی رضامندی اس کی ضامن ضرور ہے۔ پھر قرآن میں بیوی کے لیے استعمال کیے گئے 'صاحبہ' اور 'زوج' کے لفظ سے استدلال کرتے ہوئے میاں بیوی میں پائی جانے والی یکسانیت، ہم رنگی اور پیوستگی کی طرف اشارہ فرماتے ہیں۔

اس ضمن میں اگر ذیل کی چند گزارشات پر بھی نظر رہے تو امید ہے کہ ہم افراط وتفریط کے بجاے راہ اعتدال پر قائم رہ سکیں گے:

پہلی یہ کہ اس بات میں کس کو شک ہوسکتا ہے کہ مرد وعورت کا نکاح اصل میں رفاقت کے پیمان ہی کا دوسرا نام ہے اور ان کے باہمی تعلقات کی خوش گواری اسی میں ہے کہ وہ حاکم اور محکوم کی حیثیت سے نہیں، بلکہ اچھے دوستوں کی حیثیت سے ایک دوسرے کے ساتھ معاملہ کریں، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ نکاح محض مرد وعورت کی رفاقت ہی نہیں ہے، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر ایک خاندان کے ادارے کی بنیاد رکھنے کا اعلان بھی ہے۔ اور ادارے کے بارے میں ہمیں علم ہے کہ اس کی نوعیت خود اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اس کا کوئی نہ کوئی منتظم (نہ کہ حاکم) بھی ضرور ہو۔ مزید یہ کہ یہ منتظم ہو بھی صرف ایک ہی کہ ادارے کی بقا اس کی دوئی کا بار اٹھا لینے سے قطعی طور پر قاصر ہوا کرتی ہے۔ غرض یہ کہ بحث اس میں نہیں ہے کہ نکاح کے بعد خاندان کا ادارہ وجود میں آتا ہے یا نہیں اور اس ادارے کا ایک سربراہ بھی ہونا چاہیے یا نہیں، بلکہ بحث صرف اس میں ہے کہ مرد اور عورت میں سے وہ کون ہے جس کو اس ادارے کا سربراہ بنایا جائے۔ اس کا جواب دین کی تعلیم میں یہ ہے کہ یہ ذمہ داری مرد کو سونپی جائے۔ مرد ہی کو کیوں سونپی جائے، اصل میں 'بما فضل اللّٰہ بعضھم علی بعض و بما انفقوا من اموالھم' کے الفاظ اسی بات کی دلیل میں آئے ہیں کہ مرد میں چونکہ قوامیت کی خلقی صلاحیت دوسرے فریق سے زیادہ موجود ہے اور گھر در کی مالی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی اسی کے اوپر لادا گیا ہے، اس لیے مناسب یہی ہوا ہے کہ اسے ہی سربراہ بنایا جائے۔

دوسری یہ کہ ادارے کا ایک سربراہ وہ ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کی کوکھ سے جنم لیتا، کسی کے نفع ونقصان سے بے پروا ہوتا، ہر جگہ ذاتی مفاد سامنے رکھتا اور اپنے ماتحتوں کے جسم سے آخری قطرہ خون بھی چوس لینے کو بے قرار ہوتا ہے۔ اس کے مقابل میں دوسرا وہ ہے جو کسی غیر کا نہیں، اپنے گھر اور خاندان، اپنی بیوی اور اپنے ہی بچوں کی ماں کا سربراہ ہوتا ہے۔ اور پھر صرف سربراہ ہی نہیں، اس کا زوج اور صاحب ہوتا، اس کے نفع ونقصان میں شریک، اس کے دکھ سکھ کا ساتھی اور اس کی جلوت وخلوت کا ہم نشین بھی ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ پہلا سربراہ اور اس کے متعلقین، یہ سب ذاتی مفادات کے اسیر ہوتے ہیں، اس لیے ان میں باہمی الفت پیدا ہو جانا انتہائی مشکل امر ہو جاتا ہے؛ مگر یہ تو وہ ہیں کہ ان کا ہر مفاد جس قدر ذاتی ہے، اتنا ہی مشترک بھی ہے، چنانچہ یہی وجہ ہوتی ہے کہ مشترک مفاد کے حصول کی کوشش بالعموم، ان میں محبت بنائے رکھتی ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ ان دونوں قسم کے سربراہوں میں کیا ذرہ بھر بھی نسبت ہے کہ ہم ایک کی مادّہ پرستی کا ہوّا دکھائیں اور دوسرے کو جی بھر کر مطعون کریں؟ ایک کی خود غرضی کا اشتہار دیں اور دوسرے

کے خلوص کو یک سر رد کر دیں؟ یا پھر ایک کی زیر دستوں کے ساتھ بے اعتنائی کو دلیل بنالیں اور اسی بنا پر دوسرے کی حساسیت اور محبت کی بھی نفی کر دیں؟ اور ستم بالاے ستم یہ کہ اپنے اس طرز کو علم اور تحقیق کا عنوان بھی دے ڈالیں!

اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہر دور میں کچھ خام باتیں علم و عرفان کی معراج خیال کر لی جاتی ہیں۔ بعد کے دنوں میں انھی کی بنیاد پر باقاعدہ نظام فکر وجود میں آجاتے اور آخر کار وہ وقت آتا ہے کہ ہر سو انھی کا رواج ہو جاتا اور ہر دم انھی کی تقدیس گائی جانے لگتی ہے۔ عمومی قبولیت کا یہ عمل ہوتا بھی اتنا زور آور ہے کہ اس کے مقابلے میں کھڑے ہونا اور اس سے متضاد بات کہنا، انتہائی مشکل اور جان لیوا ہو جاتا ہے۔ مرد و زن کی غیر فطری مساوات کا آج کل جو غلغلہ ہے، یہ بھی اسی طرح کا معاملہ ہے۔ اس میں بھی پہلے تو یہ فرض کر لیا گیا کہ مرد اور عورت ہر حیثیت میں برابر ہوتے ہیں۔ پھر اس مفروضے کو فلسفیانہ بنیادیں فراہم کی گئیں اور عقلی انحرافات کے ذریعے سے مسلسل اس کی آبیاری کی گئی۔ اور اس کے بعد مساوات کا بہت ہی پر کشش عوامی نعرہ ایجاد کر دیا گیا کہ جو دلوں کو فریب دینے اور عام درجے کی دانش کو گم راہ کر دینے کے لیے بڑا ہی کارگر حربہ ثابت ہوا[۳]۔ جن کے دل اس نعرے نے لبھا لیے ہیں اور جن کی عقلیں اپنے دام میں لے رکھی ہیں، انھیں اب لاکھ سمجھایا جائے وہ نہیں سمجھتے کہ جب انسان ہونے کے باوجود، مرد و عورت اپنی حقیقت ہی میں مختلف ہیں تو اسی قدرتی تقسیم کی بنیاد پر اگر ان میں حقوق اور فرائض کی تقسیم بھی مان لی جائے تو اس پر آخر اعتراض کیا ہے؟ اور زیر بحث مسئلے میں بھی کیا رتی بھر اس سے زیادہ کچھ ہوا ہے کہ مرد و عورت کے مابین حقوق و فرائض کو کچھ وجوہ کی بنیاد پر تقسیم کر دیا گیا ہے، اور یہ تقسیم بھی کسی جانب داری کے تحت نہیں، بلکہ فطری اصولوں اور انصاف کے تقاضوں کے تحت ہی کی گئی ہے؟

۳؎ ہم سمجھتے ہیں کہ مرد و زن کی غیر فطری مساوات کا جو اس قدر شور ہو گیا ہے، اس میں اس مثل کا بھی بڑا دخل ہے جو کہتی ہے کہ میاں اور بیوی گاڑی کے دو پہیے ہوتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ یہ گاڑی کے دو پہیے ہی ہیں، مگر اگلے زمانوں میں یہ پہیے چونکہ یکے کے خیال کر لیے گئے تھے کہ جس سے یہ سب مسائل پیدا ہو گئے ہیں، اس لیے ہم یہ اصلاح تجویز کریں گے کہ نئے زمانے کی رعایت سے اس مثل میں یکے کی جگہ اب بائیسکل برت لینی چاہیے۔ پہیے اس کے بھی دو ہی ہوں گے، مگر اس فرق کے ساتھ کہ ایک آگے ہو گا اور ایک پیچھے۔ وگرنہ یکے کے پہیے برابری کے جذبات میں ''آمنے سامنے'' تو ضرور آ جائیں گے، مگر گھوڑا آگے جت جانے سے یہ دونوں پیچھے بھی رہ جائیں گے۔

روز جزا اللہ کی رحمت کا تقاضا ہے

انسان جب خدا کی پروردگاری کے اہتمام کو دیکھتا ہے تو یہیں سے اس پر علم و معرفت کا ایک اور دروازہ کھلتا ہے۔ یہ دروازہ ایک روز جزا و سزا کی آمد کا دروازہ ہے۔ جس دن تنہا وہی، پورے اختیار کے ساتھ انصاف کی کرسی پر بیٹھے گا اور نافرمانوں کو ان کی نافرمانیوں کی انصاف کے ساتھ سزا دے گا اور نیکوں کو ان کی نیکیوں کا فضل و رحمت کے ساتھ صلہ دے گا۔

خدا کی پروردگاری اور اس کی رحمانیت اور رحیمیت کی نشانیاں ایک روز جزا و سزا کی آمد کو کس طرح لازم کرتی ہیں؟ اس سوال کا جواب تھوڑی سی وضاحت کا طالب ہے۔

خدا کی پروردگاری سے روزِ جزا پر استدلال قرآنِ مجید نے جگہ جگہ اس طرح کیا ہے کہ جس خدا نے تمھارے لیے زمین کا فرش بچھایا اور آسمان کا شامیانہ تانا، جس نے تمھارے لیے سورج اور چاند چمکائے، جس نے ابر و ہوا جیسی چیزوں کو تمھاری خدمت میں لگایا، جس نے تمھارے تمام ظاہری اور باطنی، روحانی اور مادی مطالبات کا بہتر سے بہتر جواب مہیا کیا، کیا اس خدا کے متعلق تم یہ گمان کرتے ہو کہ بس اس نے تمھیں یوں ہی پیدا کر دیا ہے اور پیدا کر کے بس یوں ہی چھوڑ دے گا؟ یہ تمام کارخانہ محض کسی کھلنڈرے کا ایک کھیل ہے جس کے پیچھے کوئی غایت و مقصد نہیں ہے؟ تم ایک شترِ بے مہار کی طرح اس سرسبز و شاداب چراگاہ میں بس چرنے کے لیے چھوڑ دیے گئے ہو، نہ تم پر کوئی ذمہ داری ہے اور نہ تم سے کوئی پرسش ہوگی؟ اگر تم نے یہ سمجھ رکھا ہے تو نہایت غلط سمجھ رکھا ہے۔ پرورش کا یہ سارا اہتمام پکار پکار کر شہادت دے رہا ہے کہ یہ اہتمام کسی اہم غایت و مقصد کے لیے ہے اور یہ ان لوگوں پر نہایت بھاری ذمہ داریاں عاید کرتا ہے جو بغیر کسی استحقاق کے اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ایک دن ان ذمہ داریوں کی بابت ایک ایک شخص

سے پرسش ہوگی اور وہی دن فیصلہ کا ہوگا۔جنھوں نے اپنی ذمہ داریاں ادا کی ہوں گی، وہ سرخ رو اور فائز المرام ہوں گے اور جنھوں نے ان کو نظر انداز کیا ہوگا، وہ ذلیل اور نامراد ہوں گے۔ یہ مضمون قرآنِ مجید میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوا ہے، لیکن اختصار کے خیال سے صرف ایک مثال نقل کرتے ہیں:

> ''کیا ہم نے زمین کو تمھارے لیے گہوارا نہیں بنایا اور اس میں پہاڑوں کی میخیں نہیں ٹھونکیں؟ اور ہم نے تم کو جوڑا جوڑا پیدا کیا۔ اور تمھاری نیند کو دافعِ کلفت بنایا۔ رات کو تمھارے لیے پردہ پوش بنایا اور دن کو حصولِ معاش کا وقت ٹھیرایا اور ہم نے تمھارے اوپر سات مضبوط آسمان بلند کیے اور روشن چراغ بنایا اور ہم نے بدلیوں سے دھڑا دھڑ پانی برسایا تاکہ اس سے ہم غلے اور بناتات اگائیں اور گھنے باغ پیدا کریں۔ بے شک فیصلہ کا دن مقرر ہے۔''
>
> (النبا ۷۸: ۶-۷)

''بے شک فیصلہ کا دن مقرر ہے۔'' یعنی یہ چیزیں اس بات کی گواہی دے رہی ہیں کہ جس نے یہ کچھ اہتمام انسان کے لیے کیا ہے، وہ انسانوں کو یوں ہی شترِ بے مہار کی طرح چھوڑے نہیں رکھے گا بلکہ اس کی نیکی یا بدی کے فیصلے کے لیے فیصلہ کا ایک دن بھی لائے گا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے رحمان اور رحیم ہونے کا یہ لازمی نتیجہ قرار دیا ہے کہ ایک ایسا دن بھی وہ لائے جس میں اچھوں اور بروں کے درمیان انصاف کرے، نیکوکاروں کو ان کی نیکیوں کا صلہ دے، اور بدکاروں کو ان کی برائیوں کی سزا دے۔ ایک رحمان اور رحیم ہستی کے لیے یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ ظالم اور مظلوم، نیکوکار اور بد، باغی اور وفادار دونوں کے ساتھ ایک ہی طرح کا معاملہ کرے، ان کے درمیان ان کے اعمال کی بنا پر کوئی فرق نہ کرے۔ نہ ظالم کو اس کے ظلم کی سزا دے نہ مظلوم کی مظلومیت کا ظالم سے انتقام لے۔ اگر زندگی کا یہ کارخانہ اسی طرح ختم ہو جاتا ہے، اس کے بعد جزا و سزا اور انعام و انتقام کا کوئی دن آتا نہیں ہے تو اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ العیاذ باللہ اس دنیا کے پیدا کرنے والے کی نگاہوں میں متقی اور مجرم دونوں برابر ہیں بلکہ مجرم نسبتاً اچھے ہیں جن کو جرم کرنے اور فساد برپا کرنے کے لیے اس نے بالکل آزاد چھوڑ رکھا ہے۔ یہ چیز بداہتہً غلط اور اس کے رحمان اور رحیم ہونے کے بالکل منافی ہے چنانچہ اس نے نہایت واضح الفاظ میں اس کی تردید فرمائی۔ مثلاً:

> ''کیا ہم اطاعت کرنے والوں کو مجرموں کی طرح کر دیں گے، تمھیں کیا ہوگیا ہے، تم کیسا فیصلہ کرتے ہو؟''
>
> (القلم ۶۷: ۳۶)

اور اپنے رحمان اور رحیم ہونے کا یہ لازمی نتیجہ بتایا ہے کہ ایک دن وہ سب کو جمع کر کے انصاف کرے گا اور ہر ایک کو اس کے اعمال کے مطابق بدلہ دے گا۔ چنانچہ فرمایا ہے:

''اس نے اپنے اوپر رحمت واجب کر لی ہے، وہ قیامت تک، جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں ہے، تم کو ضرور جمع کر کے رہے گا۔'' (الانعام ۶: ۱۲)

اس سے صاف واضح ہے کہ قیامت دراصل خدا کی رحمت کا مظہر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر رحمت واجب کر رکھی ہے۔ اس وجہ سے وہ فیصلے کا ایک دن ضرور لائے گا جس میں وہ سب کو اکٹھا کر کے ان کے درمیان انصاف فرمائے گا۔ اور یہ بھی عین اس کی اس رحمت ہی کا تقاضا ہے کہ اس دن کسی کو مجال نہ ہو گی کہ اس کے فیصلوں میں کوئی مداخلت کر سکے اور اپنی سفارشوں سے حق کو باطل یا باطل کو حق بنا سکے، بلکہ ہر ایک کے لیے بالکل بے لاگ اور پورا پورا انصاف ہو گا۔

اس سے یہ نکتہ بھی واضح ہوا کہ عدل اور رحمت میں کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ عدل عین رحمت ہی کا تقاضا ہے۔

—— امین احسن اصلاحی

تعلق بالقرآن

عن ابی موسیٰ اشعری، قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم، مثل المومن الذی یقراء القرآن مثل الا ترجۃ ریحھا طیب وطعمھا طیب . ومثل المؤمن الذی لا یقراء القرآن مثل التمرۃ لا ریح لھا وطعمھا حلو. ومثل المنافق الذی لا یقراء کمثل الحنظلۃ لیس لھا ریح وطعمھا مر . ومثل المنافق الذی یقراء القرآن مثل الریحانۃ ریحھا طیب وطعمھا مر. (مشکوٰۃ، کتاب فضائل القرآن)

''ابوموسیٰ اشعری کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس مومن کی مثال جو قرآن پڑھتا ہے، ترنج[1] کی سی ہے، جس کی خوش بو بھی اچھی ہے اور ذائقہ بھی۔ اور قرآن نہ پڑھنے والے مومن کی مثال کھجور کی سی ہے، جس کی خوش بو تو نہیں ہوتی، مگر ذائقہ میٹھا ہوتا ہے۔ اور قرآن نہ پڑھنے والے منافق کی مثال اندرائن[2] کی سی

---

[1] ترنج، چکوترے کی طرح سٹریس (CITRUS) قسم کا ایک صحرائی پھل۔

ہے، جو ذائقہ میں کڑوا ہوتا ہے، اور اس میں خوش بو بھی نہیں ہوتی۔ اور قرآن مجید پڑھنے والے منافق کی مثال گل ریحان کی سی ہے، جس کی خوش بو تو اچھی ہوتی ہے، مگر ذائقہ بہت کڑوا ہوتا ہے۔‘‘

یہ ابوموسیٰ اشعری کی روایت ہے۔ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تمثیل سے یہ سمجھایا ہے کہ قرآن مجید سے تعلق کی کیا کیا نوعیتیں ہیں۔ اور سب سے اچھا تعلق کیا ہے۔ چنانچہ پہلی دو مثالیں مومن خالص کے حوالے سے ہیں، اور دوسری دو مثالیں ان لوگوں کے بارے میں ہیں، جو اپنے ایمان میں سچے نہیں ہیں۔

پہلی مثال میں دیکھیے کہ آپ نے اس بندۂ مومن کی مثال دی ہے، جو نہ صرف اپنے ایمان میں سچا ہے، بلکہ قرآن سے بھی شغف رکھتا ہے، وہ اسے پڑھتا ہے اور پڑھاتا بھی ہے۔ اس کی مثال ترنج کی سی ہے، یعنی وہ ترنج کی طرح اپنی ذات میں بھی خوب ہے، اور جو کچھ اس سے، قرآن کی صورت میں، لوگوں کو حاصل ہو رہا ہے، وہ بھی ترنج کی خوش بو کی طرح نہایت اچھا ہے۔ یعنی، قرآن کی صورت میں جو پیغام ربانی اس کے پاس ہے، وہ خوش بو بن کر عالم میں پھیل رہا ہے۔ سچا مومن ہونے کی وجہ سے اس کا وجود دوسروں کے لیے سراپا خیر ہے۔ یعنی، وہ خود بھی میٹھا ہے اور اس کی خوش بو بھی بہت عمدہ ہے۔

دوسری مثال اس بندۂ مومن کی ہے، جو قرآن سے اس طرح کا گہرا تعلق نہیں رکھتا۔ اس کی مثال کھجور کے پھل کی سی ہے، جس کا ذائقہ تو اچھا ہے، لیکن اس میں خوش بو نہیں ہوتی۔ یعنی، یہ شخص مومن ہونے کی وجہ سے تو لوگوں کے لیے سراپا خیر ہے، لیکن قرآن کے ساتھ مطلوب تعلق نہ ہونے کی وجہ سے اس کے پاس جو دعوت ہے، وہ دوسروں تک پہنچنے نہیں پاتی۔ گویا وہ خود تو میٹھا ہے، لیکن دعوت خیر اس کی ذات سے خوش بو کی طرح نہیں پھیلتی۔

تیسری مثال اس منافق کی ہے، جو قرآن کو پڑھتا پڑھاتا بھی نہیں ہے، اور سچا مومن بھی نہیں ہے، یعنی وہ اپنی ذات میں بھی اچھا نہیں ہے اور لوگوں کو دینے کے لیے بھی اس کے پاس قرآن جیسی اچھی دعوت نہیں ہے۔ گویا وہ اندرائن کی طرح کڑوا ہے، یعنی لوگوں کے ساتھ اس کا تعلق، خیر کا نہیں ہوگا۔ وہ نفاق اور بے یقینی پھیلانے کا باعث بنے گا۔ اس کی خوش بو نہیں ہے، یعنی اس سے کوئی خیر لوگوں کو میسر نہیں آئے گا۔ اس تشبیہ میں ایک اور پہلو یہ بھی ہے کہ اندرائن دیکھنے میں بہت خوبصورت ہوتا ہے۔ اسے پہلی مرتبہ دیکھنے والا لذیذ اور اعلیٰ قسم کا پھل سمجھتا ہے، جب کہ وہ نہایت کڑوا ہوتا ہے۔ یہی حال منافق کا بھی ہوتا ہے کہ وہ بظاہر تو مومن ہوتا ہے، مگر اندر سے وہ منافقت کی تلخی سے بھرا ہوتا ہے۔

۲؎ اندرائن، حنظل، خربوزے کی طرح کا ایک پھل، جو دیکھنے میں خوبصورت اور ذائقہ میں کڑوا ہوتا ہے۔

چوتھی مثال اس منافق کی ہے، جو اپنے نفاق کے ساتھ قرآن مجید کو پڑھتا پڑھاتا ہے۔ فرمایا کہ اس کی مثال ریحان کی طرح ہے، جو ذائقہ میں کڑوا، البتہ خوش بو میں نہایت خوش گوار ہوتا ہے۔ منافق، اپنی ذات میں برا ہے، یعنی ریحان کی طرح کڑوا ہے، لیکن قرآن مجید کے پڑھنے پڑھانے سے لوگ حق کی خوش بو اس سے پاتے رہتے ہیں۔

اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کے ساتھ مختلف رویوں کی نشان دہی مثالوں کے ذریعے سے فرمائی ہے جس سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ کون سا رویہ آپ کے نزدیک سب سے زیادہ اچھا ہے۔ اس روایت میں ایک خاص بات اس بے مثال پیغمبرانہ تکلم کی ایک جھلک ہے جس میں داعیانہ رنگ بھی ہے اور معلمانہ شان بھی۔

چنانچہ سب سے بہتر وہ آدمی ہے جو بندۂ مومن ہونے کے ساتھ ساتھ قرآن مجید پڑھتا پڑھاتا بھی ہو۔ اسی بات کو آپ نے ایک اور موقع پر اس طرح بیان فرمایا ہے:

خیر کم من تعلم القرآن و علمه.
''تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جس نے قرآن سیکھا اور دوسروں کو سکھایا۔''
(بخاری، کتاب فضائل القران)

—— محمد رفیع مفتی